آزادی کی نظمیں

سبط حسن

به اشتراک

اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

آزادی کی نظمیں

سبط حسن

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک -1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

بہ اشتراک

اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے اس نے مختلف اقدام کیے ہیں جن میں کمپیوٹر ایپلیکیشن، ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔، کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن اور اردو رسم الخط میں سرٹیفکیٹ کورس شامل ہیں۔ ان اقدامات کے ذریعے اردو زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے اردو تعلیم کے منظرنامے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کوشش کو بڑی حد تک کامیابی بھی ملی ہے۔

قومی اردو کونسل کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابوں کی طباعت اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اس لیے اردو زبان کا وہ کلاسیکی سرمایہ جو دھیرے دھیرے نایاب ہوتا جارہا ہے، قومی اردو کونسل نے اس کی مکرر اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔

اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کے کارہائے نمایاں میں سے ایک اہم کام ان اردو کتابوں کی ترتیب و تہذیب اور ان کی اشاعت ہے جن کا شمار اردو کے کلاسیکی سرمائے میں ہوتا ہے۔ ان کتب کی اردو شائقین کے حلقوں میں جس قدر پذیرائی ہوئی ہے وہ محتاج بیاں نہیں۔ اس لیے اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کی تمام مطبوعات کو ان کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل ایک مشترکہ معاہدے کے تحت ازسرنو شائع کرے گی۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گی کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

رشمی چودھری
ڈائرکٹر انچارج

فہرست

عرضِ مرتّب

وسطِ فروری میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سالانہ کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی اور یہ طے پایا کہ آزادی کی نظموں کا ایک مجموعہ مارچ تک تیار کرلیا جائے۔ یہ خدمت ادارہ ''نیا ادب'' کے سپرد کی گئی۔ ادارے نے اس مختصر مدت میں جو انتخاب کیا ہے وہ ایک مجموعے کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ہمیں مجموعے کے نقائص کا علم ہے اور اعتراف بھی۔ لیکن ان خرابیوں کی ذمہ داری ہم سے زیادہ وقت کی تنگی پر ہے۔ ہمیں بڑی ندامت ہے کہ ہم کئی مستند اور مشہور شاعروں کے کلام سے فائدہ بھی نہ اٹھا سکے لیکن اس مختصر وقت میں کیا اس سے بہتر انتخاب ممکن تھا؟

یہ تمہید مسٹر محمد عتیق کے ذکر کے بغیر نامکمل رہ جائے گی۔ عتیق صاحب نے نظموں کے انتخاب، ان کی فراہمی، اور طباعت کے سلسلے میں بڑی محنت کی ہے۔ ان کی اس ادبی خدمت اور بےلوث جفاکشی پر ادارہ ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ آخر میں ہم ان پبلشرز کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جن کے مطبوعات سے شاعروں کے کلام کے انتخاب میں مدد لی گئی۔

لکھنؤ

سبطِ حسن

13 / مارچ 1940

تعارف

از

مسٹر رفیع احمد قدوائی

ایک حکیم کا قول ہے کہ آزادی، ضرورتوں کو محسوس کرنے کا دوسرا نام ہے۔ ممکن ہے کہ اس قول میں کچھ مبالغہ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہماری دنیاوی ضرورتوں اور آزادی کے تصور میں بہت گہرا تعلق ہے۔ دنیاوی ضرورتیں بڑھتی، بدلتی اور نت نئی شکل اختیار کرتی رہتی ہیں۔ جنگلی جانوروں کے شکار پر گزر بسر کرنے والوں اور کھیتی باڑی کرنے والوں کی ضروتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ہل جوتنے اور صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والوں کی ضرورتیں بھی الگ ہوتی ہیں۔ ان کا آزادی کا تصور بھی مختلف ہوتا ہے بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ آزادی کا تصور بھی انسانوں کی ضرورتوں کے ساتھ بدلتا اور ترقی کرتا رہتا ہے۔ ہندوستان کی پچھلے ڈیڑھ سو سال کی تاریخ اس بیان کی تائید کرتی ہے۔ جس رفتار سے ہم میں اپنی ضرورتوں کا احساس بڑھا آزادی کے تصور نے بھی اسی رفتار سے ترقی کی۔

انگریزی راج 1857 سے پہلے قائم ہو چکا تھا لیکن اس سے پہلے ہم کو اپنی غلامی کا احساس نہ ہوا تھا اور نہ ہم نے اس کی نوعیت پہچانی تھی۔ لیکن زندگی کی ضرورتوں نے جلد ہی بتا دیا کہ کوئی چیز ہم سے چھین لی گئی ہے ہم نے کوئی چیز کھودی ہے۔ اس ''احساسِ زیاں'' نے ہم سے آزادی کا ایک دھندلا سا خاکہ بنایا لیکن ابتدا میں یہ خاکہ ہی خاکہ تھا۔ برطانوی حکومت پردیسی سہی پر اس نے ملک میں امن قائم کیا تھا۔ ریل گاڑیاں چلائی تھیں، تارگھر اور اسپتال کھولے تھے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے لوگ اسی بنا پر یہ توقع کیا کرتے تھے کہ دوسری ضرورتوں کا پورا ہونا بھی تاج برطانیہ کے سایہ تلے ہی ممکن ہے۔ برطانوی تسلط اور زندگی کی ضرورتوں میں انھیں کوئی تضاد نہیں نظر آتا تھا لیکن زندگی کی ضرورتیں خیالی نہ تھیں جو دل کو تسکین دینے سے دور ہو جاتیں۔ ''کرم'' اور تقدیر کے مہلک ساجک فلسفے نے کچھ

عرصے تک فریب میں مبتلا رکھا۔ آخر وہ وقت آ ہی گیا جب ہندوستانیوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ برطانوی راج اور ہماری زبوں حالی میں کوئی تعلق ضرور ہے۔ سیاسی جماعتوں کا قیام اسی احساس کا نتیجہ تھا۔ اس کے باوجود انیسویں صدی میں انگریزی راج سے گلوخلاصی کا خواب نہ دیکھا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ ہم میں اس وقت تک اپنی مادّی ضرورتوں کا کافی احساس ہی پیدا نہ ہوا تھا یا اگر پیدا ہوا تھا تو ہم یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ ہماری ضرورتوں کے پورا نہ ہونے کی اصلی وجہ ہماری غلامی ہی ہے۔ حکومت کے سامنے عرضیاں گزرانی جاتیں، محضر پیش ہوتے، شکایتوں کے دفتر کھلتے، وطنیت کے گیت گائے جاتے، حبِ وطن کے نعرے لگتے لیکن یہ سب تاجِ برطانیہ کی وفاداری کی قسم کھا کھا کر۔ مکمل آزادی کے مطالبے کا کوئی سوال نہ اٹھتا۔ ہندوستان غریب سے غریب تر ہوتا گیا۔ آخر کار وہ وقت بھی آ پہنچا جب مفلسی اور فاقہ کشی نے ہندوستانیوں کو کراہنے اور چیخنے پر مجبور کر دیا۔ انگریزی حکومت کے مظالم اور وعدہ خلافیوں نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور دھیرے دھیرے یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ ہماری ساری مصیبتوں کی ذمہ داری اسی پردیسی حکومت پر ہے۔ سیاسی حالات اور سماجی ضرورتوں نے اس خیال کو اور ابھارا اور وہ دن بھی آ گیا جب ہندوستانی انگریزی حکومت سے۔ اسی انگریزی حکومت سے جس کی وفاداری کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔۔۔ ٹکر لینے لگے۔ ہندوستانیوں پر گولیاں برسیں اور ڈنڈے پڑے، ان کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنائی گئیں، ان کے گھر لوٹے گئے، ان کی جائدادیں ضبط کی گئیں اور ان پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے لیکن بند ٹوٹ چکا تھا، سیلاب کا دھارا بہہ نکلا تھا اور زندگی کی ضرورتوں نے آزاد ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ ہر طرف سے مکمل آزادی کے نعرے لگنے لگے اور ہر شخص محسوس کرنے لگا کہ انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا پانا ضروری ہے۔ قدم آگے بڑھے اور ہندوستان کی چہار دیواری کے باہر نظر دوڑائی گئی تو یہ معلوم ہوا کہ ان ملکوں میں بھی جہاں لوگوں کو سیاسی آزادی حاصل ہے عوام کی حالت کچھ زیادہ بہتر نہیں۔ وہاں بھی بھوکوں اور بے روزگاروں کی تعداد کافی ہے اور زندگی کی ضرورتیں ٹھیک طرح پوری نہیں ہوتیں۔ چنانچہ یہ خیال بھی ظاہر کیا جانے لگا کہ صرف سیاسی آزادی کافی نہیں بلکہ عوام کی معاشی آزادی کی ضمانت بھی ضروری ہے۔ یہ سچ ہے کہ سیاسی آزادی کے بغیر معاشی آزادی ممکن نہیں لیکن وہ سیاسی آزادی کس کام کی جس میں عوام کو معاشی آزادی نہ حاصل ہو بلکہ انھیں صرف بھوکا مرنے کے لیے آزاد کر دیا جائے۔ سوشلسٹ تحریک کی بنیاد انھی دلیلوں پر قائم ہے۔

اوپر کی چند سطروں سے یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ ہمارے ملک میں آزادی کا ابتدائی تصور کیا تھا، اور پچھلے

پچھتر، اسّی سال میں دھیرے دھیرے اس میں کتنی تبدیلی ہوئی ہے۔ ہندوستانی ادب بالخصوص ہندوستانی شاعری پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ آزادی کے موجودہ تصور تک پہنچنے میں، جتنے زینے ہندوستانی سماج نے طے کیے ہیں، اتنے ہی ہمارے ادب نے بھی کیے ہیں۔ جتنے دور ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں آئے ہیں اتنے ہی دور ہمارے ادب پر بھی آئے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ادب اور زندگی میں بڑا بنیادی تعلق ہے۔ ادب زندگی کی حقیقتوں اور ضرورتوں کا ایسا عکس ہوتا ہے جو خود زندگی پر اثر ڈالتا چلتا ہے۔ وہ زندگی کی وسعتوں کے ساتھ پھیلتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو شاعری میں آزادی کے تصور ہی کو لیجیے۔ زندگی کی ضرورتوں کا احساس جس رفتار سے بڑھا، ہندوستانی سماج میں حرکت اور بیداری کی لہریں جس تیزی سے آئیں اسی رفتار سے اور تیزی سے اردو شاعروں کا آزادی کا تصور بدلا۔ غالب 57ء کے قتل اور غارت گری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے لیکن ان کی ذہنی قوتیں اس قومی تباہی پر غصے اور رنج کا اظہار کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھیں کیوں کہ اس وقت ہندوستانی سماج کا ذہن اس سے آگے نہ بڑھا تھا۔ آزاد، حالی اور اسمٰعیل کے زمانے میں وطنیت کا صور پھونکا جا چکا تھا۔ ہندوستانی قوم اپنی مجبوریوں کو محسوس کرنے لگی تھی لیکن جیسا میں نے اوپر لکھا ہے یہ "صرف خاکہ ہی خاکہ تھا۔" یہی وجہ ہے کہ آزاد، حالی اور اسمٰعیل کے کلام میں حبِ وطن کا بہت ابتدائی تصور پایا جاتا ہے۔ اس میں آزادی کے نقوش شاذ ہی نظر آئیں گے۔ قوم نے ایک اور انگڑائی لی تو حبِ وطن کے اسی خام تصور کے بطن سے آزادی کا وہ تصور پیدا ہوا جو اقبال، چکبست اور ابتدائی بیسویں صدی کے دوسرے شاعروں کے کلام میں جھلکتا ہے۔ لیکن زندگی کی ضرورتوں نے جلد ہی اس تصور کو بھی ناکافی قرار دے دیا۔ سیاسی آزادی کے ساتھ عوام کی معاشی آزادی کا مطالبہ ہونے لگا۔ ہندوستانی قوم نے ایک اور کروٹ لی، ایک نیا دور شروع ہوا جس کے میر کارواں جوش ملیح آبادی ہیں۔ دورِ حاضر کے نوجوان شعرا کا آزادی کا تصور دراصل بازگشت ہے ان سماجی ضرورتوں اور سیاسی تحریکوں کی جن میں سیاسی آزادی کے ساتھ قوم کی معاشی آزادی پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ نئے شعرا وطنیت کے تنگ دائرے سے نکل گئے ہیں، وطنیت کا وہ تصور جس کا بیج آزاد اور حالی نے بویا تھا اب اتنا بلند ہو چکا ہے کہ دورِ حاضرہ کے شاعر اور ادیب صرف انگریزی حکومت کے خاتمے کو ملک کے لیے کافی نہیں سمجھتے۔ وہ سماجی انقلاب اور مزدوروں اور کسانوں کے راج کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ بین الاقوامی تحریکوں سے کافی متاثر ہیں اور ان کا خیال ہے کہ سماجی ضرورتیں۔ مادّی اور روحانی۔ صرف سیاسی آزادی حاصل ہو جانے سے پوری نہیں ہوں گی بلکہ ان

کے لیے سماجی انقلاب کی ضرورت ہے۔ ان کے نزدیک سچی آزادی-انفرادی اور جماعتی- صرف ایک ایسے سماجی نظام میں ممکن ہے جس میں ایک فرد دوسرے فرد پر حکومت نہ کرتا ہو اور نہ ایک فرد دوسرے فرد کی ذہنی اور جسمانی قوتوں سے ذاتی فائدہ اٹھاتا ہو۔ ہماری قومی زندگی اور اسی کے ساتھ ہماری ادبی زندگی ان دنوں ارتقا کے اسی دور سے گزر رہی ہے۔

آزادی کی نظموں کا زیرِ نظر مجموعہ صرف نظموں کا مجموعہ نہیں بلکہ احساسِ غلامی کے ارتقا کی تاریخ ہے اور مجھے خوشی ہے کہ مرتب نے انتخاب کی بنیاد قومی زندگی کی انھی حقیقتوں پر رکھی ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس انتخاب سے اس دعوے کی بھی کہ ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے، تائید ہوتی ہے۔ اگر ان نظموں کو غور سے پڑھا گیا تو نہ صرف آزادی کے تصور کا تدریجی ارتقا واضح ہو جائے گا بلکہ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ آج ہم کس منزل پر ہیں، ہمارے رجحانات کیا ہیں اور ہماری آئندہ منزل کیا ہوگی۔

اس مجموعے کی اشاعت ایک قومی خدمت ہے اور مجھے امید ہے کہ قوم، مرتب کی حوصلہ افزائی کر کے وطنی آزادی کے جوش کا ثبوت دے گی۔

رفیع احمد قدوائی

7/ مارچ 1940

مرزا اسدُ اللہ خاں غالب

1796 —— 1869

1857 میں غالب دہلی ہی میں تھے۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ سے اوپر تھی۔ قومی حکومت کے خاتمے اور ملک کی تاراجی کا اثر ان کی حسّاس طبیعت نے قبول تو کیا لیکن اپنے ہم عصروں کی طرح وہ بھی ذہنی تضاد سے بچ نہ سکتے تھے۔ ملک کی زبوں حالی پر انھیں غصہ بھی آتا، افسوس بھی ہوتا لیکن وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ انگریزوں کی غلامی سے مفر ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک طرف نجی خطوط اور زیرِ نظر قطعے میں وہ قومی حکومت کے ختم ہو جانے پر افسوس کرتے ہیں تو دوسری طرف منظرِ عام پر انگریزوں کی تعریف کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ لیکن تعریف کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ یہ تعریف حالات سے مجبور ہو کر کی گئی ہے اور دلی رجحان کچھ اور ہی ہے۔

1857

بسکہ فعالِ مایرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہرِ دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا

گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

مولوی محمد حسین آزاد

1829 ——— 1910

آزاد دہلی نژاد تھے۔ ابتدائی تعلیم ذوق کی نگرانی میں ہوئی۔ شعر گوئی بھی انھی کی صحبت میں سیکھی۔ مزید تعلیم اورینٹل کالج دہلی میں حاصل کی۔ غدر کے بعد جب ان کے والد مولوی محمد باقر کو پھانسی دی گئی تو آزاد نے آبائی وطن کو خیر باد کہا اور حیدر آباد چلے گئے۔ 1864 میں لاہور آئے اور سر رشتۂ تعلیم میں نوکر ہوئے اور پھر آخر وقت تک لاہور ہی میں رہے۔ وہیں مئی 1874 میں آزاد نے اپنی مشہور نظم ''شب قدر'' ایک تمہیدی مقالے کے ساتھ انجمن پنجاب کے جلسے میں سنائی۔ آزاد نے اس مقالے میں اردو شاعری کے جدید رجحانات کے اصول مرتب کیے اور بتایا کہ شاعری صرف حسن و عشق تک محدود رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اردو شاعری کے جدید دور کا آغاز اسی نظم سے ہوتا ہے۔ آزاد اردو شاعری کے نئے دور کے باوا آدم ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ نثر نگاری میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں چنانچہ آبِ حیات، نیرنگِ خیال، دربارِ اکبری، نگارستانِ فارس، قصصِ ہند، سخندانِ فارس وغیرہ ان کی یادگار تصنیفیں ہیں۔

حُبِّ وطن

اے آفتابِ حبِّ وطن تو کدھر ہے آج / تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج

تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر ہورہا / اور انتظامِ دل زبروزیر ہورہا

تجھ بن سب اہلِ درد ہیں دل مردہ ہو رہے / اور دل کے شوق سینوں میں افسردہ ہو رہے

ٹھنڈے ہیں کیوں دلوں میں ترے جوش ہوگئے / کیوں سب ترے چراغ ہیں خاموش ہوگئے

حبِّ وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں / حیراں ہوں آج کل ہے پڑا اس کا کال کیوں

کچھ ہوگیا زمانے کا الٹا چلن یہاں / حبّ الوطن کے بدلے ہے بغض الوطن یہاں

بن تیرے ملکِ ہند کے گھر بے چراغ ہیں / جلتے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں

کب تک شبِ سیاہ میں عالم تباہ ہو / اے آفتاب ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو

الفت سے گرم سب کے دلِ سرد ہوں بہم / اور جو کہ ہم وطن ہوں وہ ہمدرد ہوں بہم

تا ہو وطن میں اپنے زرو مال کا وفور / اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور

علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں / اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں

لبریزِ جوشِ حبِّ وطن سب کے جام ہوں
سرشارِ ذوق و شوق دلِ خاص و عام ہوں

خواجہ الطاف حسین حالی

1837 —— 1914

حالی پانی پت کے رہنے والے تھے۔ شاعری میں شیفتہ اور غالب سے مشورہ کرتے تھے۔ 57 کے بعد پنجاب گورنمنٹ کے بک ڈپو لاہور میں پرانی کتابوں کا لٹریچر موجودہ زمانے کے مطابق درست کرنے پر مامور ہوئے۔ چار سال بعد اینگلو عربک اسکول دہلی کی مدرّسی پر مقرر ہوئے۔ یہیں سرسیّد سے ملاقات ہوئی اور کچھ دنوں کے بعد حالی سرسیّد کی قومی تحریک کے ایک ممتاز رکن ہوگئے۔ انھی کے ایما سے 1879 میں حالی نے مسدّس لکھا جس نے ان کی علمی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔ حالی نثر اور نظم دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ نثر میں مقدمۂ شعروشاعری، حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب اور مقالاتِ حالی اور نظم میں مسدّس، مناجاتِ بیوہ، چپ کی داد، شکوۂ ہند زیادہ مشہور ہیں۔

آزادی کی قدر

ایک ہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنھیں
قدرداں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم

ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم

عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا
بینوا کو دیں سے زیادہ قدرِ دینار و درم

تعرف الاشیاء بالاضداد ہے قولِ حکیم
دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم

سن کے اک آزاد نے یہ لاف چپکے سے کہا
ہے سقر[1] موری کے کیڑے کے لیے باغِ ارم

انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

کہتے ہیں آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس
یاں غلام آکر، کرامت ہے یہ انگلستان کی

اس کی سرحد میں غلاموں نے جوں ہی رکھا قدم
اور کٹ کر پاؤں سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی

قلب ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا
کم نہیں کچھ قلب ماہیت میں ہندوستان بھی

آن کر آزاد، یاں آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہو کر غلام اس کی ہوا جن کو لگی

سیاست

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
واں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو

اور عقل خلاف اس کے یہ تھی مشورہ دیتی
یہ حرف سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو

پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر
مانو اسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو

کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن
جو بات سبک ہو اسے منہ سے نہ نکالو

---

[1] یعنی جس طرح موری کے کیڑے کو موری میں آرام ملتا ہے وہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتا اسی طرح جو قومیں ہمیشہ محکوم رہتی چلی آئی ہیں وہ غلامی ہی میں خوش رہتی ہیں۔۱۲

مولوی محمد اسمٰعیل

1844 —— 1917

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ سولہ سال کے سن میں سررشتۂ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ کچھ عرصے بعد فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہوئے۔ سہارن پور اور میرٹھ میں عرصے تک رہنے کے بعد 1888 میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ آئے اور 1899 میں پنشن لی۔ بقیہ عمر میرٹھ میں گزاری اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ نومبر 1917 میں رحلت کی۔ اسمٰعیل شاعر اور نثار دونوں تھے۔ ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ بچوں کی ریڈریں اور نصاب کی وہ کتابیں ہیں جو دس سال پہلے تک سارے ملک میں رائج تھیں۔ انھیں ہندوستانی زبان کا ادیب کہنا بے جا نہ ہوگا کیوں کہ ان کی نثر اور نظم دونوں میں عام بول چال کے لفظوں کی کثرت ہے۔ ان کی تحریر بڑی سادہ سلیس اور دلکش ہوتی ہے جو نہ صرف بچوں کے لیے مفید ہے بلکہ بڑوں کو بھی اس سے سبق لینا چاہیے۔ اسمٰعیل کی اکثر تصنیفیں ہندوستان زبان کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔ ان کے مفصل حالات اسلم سیفی صاحب کی کتاب ''کلیات و حیاتِ اسمٰعیل'' میں ملیں گے۔

آزادی غنیمت ہے

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر   تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو   بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو

اچھا زمانہ آنے والا ہے

(۱)

تنے گا مسرت کا اب شامیانہ   بجے گا محبت کا نقار خانہ
حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ   کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

(۲)

نہ ہم روشنی دن کی دیکھیں گے لیکن   چمک اپنی دکھلائیں گے اب بھلے دن
رُکے گا نہ عالم ترقی کیے بن   کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

(۳)

ہر اک توپ سچ کی مددگار ہوگی   خیالات کی تیز تلوار ہوگی
اسی پر فقط جیت اور ہار ہوگی   کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

(۴)

زبانِ قلم سیف پر ہوگی غالب   دبیں گے نہ طاقت سے پھر حق کے طالب
کہ محکوم حق ہوگا دنیا کا طالب   کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

(۵)

زمانہ نسب کو نہ پوچھے گا ' ہے کیا   مگر وصفِ ذاتی کا ڈنکا بجے گا
اسی کو بڑا سب سے مانے گی دنیا   کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

(۶)

لڑائی کو انسان سمجھیں گے ذائن　　تفاخر پہ ہوگی نہ قوموں میں اَن بن
مشیخت کی خاطر اڑے گی نہ گردن　　کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

(۷)

عقیدوں کی مٹ جائے گی سب رقابت　　مذاہب کو ہوگی تعصب سے فرصت
مگر ان کی بڑھ جائے گی اور طاقت　　کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

(۸)

کریں سب مدد ایک کی ایک مل کر　　یہی بات واجب ہے ہر مردو زن پر
لگے ہاتھ سب کا تو اٹھ جائے چھپر　　کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

شبلی نعمانی

1857 ——— 1914

مولانا شبلی ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ علم کی تحصیل ضلع کے علمی حلقوں میں کی پھر سرسید مرحوم نے علی گڑھ کالج میں پروفیسر مقرر کیا۔ مولانا شبلی سولہ سال تک کالج میں رہے۔ اسی زمانے میں بلادِ اسلامیہ کا سفر بھی کیا۔ سرسیّد کی رحلت کے بعد 1898 میں مولانا شبلی کالج سے سبکدوش ہو کر حیدر آباد گئے وہاں سلسلۂ آصفیہ میں شعبۂ مصنّفین میں مامور رہے۔ ایک عرصے کے بعد لکھنو آئے اور ندوۃ العلماء کی خدمت میں مصروف رہے لیکن 1912 میں مولانا کو مجبوراً ندوہ کو خیر باد کہنا پڑا وطن واپس جا کر انھوں نے دارالمصنّفین اعظم گڑھ کی بنیاد رکھی۔ اردو ادب میں شبلی کی حیثیت کے ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک ادارے کی ہے۔ ان کی معلومات بڑی جامع تھیں۔ انھوں نے مختلف ادبی، علمی اور مذہبی مسائل پر کتابیں لکھیں جن کی تعداد کافی بڑی ہے۔ ان کا ادبی مذاق بہت پاکیزہ تھا۔ یہ ستھرا پن ان کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔ ادبی تصانیف میں شعر العجم، موازنۂ انیس و دبیر اور مقالاتِ شبلی زیادہ مشہور ہیں۔

احرارِ قوم

اور

طفلِ سیاست

یہ اعتراض آپ کا بیشک صحیح ہے
احرارِ قوم میں ہیں بہت خامیاں ابھی
چلتے ہیں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
گم کشتۂ طریق ہے یہ کاررواں ابھی
زود اعتقادیاں ہیں، تلوّن ہے، وہم ہے
ہو جاتے ہیں ہر ایک سے یہ بدگماں ابھی
دل میں ہے عزم اور نہ ارادوں میں ہے ثبات
جھیلے نہیں ہیں معرکۂ امتحاں ابھی
بے اعتدالیاں ہیں ادائے کلام میں
باہر ہے اختیار سے اُن کے زباں ابھی
ہر دم ہے گو مسائلِ ملکی زبان پہ
اُن میں سے ایک بھی تو نہیں نکتہ داں ابھی

....

یہ سب بجا درست، مگر سچ جو پوچھیے
جو کچھ کہ ہے، یہ ہے اثرِ رفتگاں ابھی
یہ ہے اسی سیاستِ پارینہ کا اثر
گو شمع بجھ چکی ہے، مگر ہے دھواں ابھی
موزوں نہیں ہے جنبشِ اعضا تو کیا عجب
شب کے خمار کی یہ ہیں انگڑائیاں ابھی
چلنے میں لڑکھڑاتے ہیں اک اک قدم پہ پاؤں
چھوٹے ہیں قیدِ سخت سے یہ خستہ جاں ابھی
بیکار کردیے تھے جو خود بازوئے عمل
گو کھینچتے ہیں پر نہیں کھنچتی کماں ابھی
آئے کہاں سے قوتِ رفتار پاؤں میں
کچھ بیڑیاں ہیں پاؤں کی بندِگراں ابھی

غوغا ہے، کچھ مباحثِ ملّی نہیں ہیں یہ
اک طفل ہے، سیاستِ ہندوستاں ابھی

o

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو !
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ جوش انگیزیِ طوفانِ بیدادو بلا تا کے
یہ لطف اندوزیِ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخمہائے خوں چکاں کب تک
یہ مانا گرمیِ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمھیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا قصۂ غم سے تمھارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کب تک
عروسِ بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک

o

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو
دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں
کردیا ذرۂ افسردہ کو ہم رنگِ شرار
یا کوئی جاذبۂ ملک و وطن تھا جس نے
کردیے دم میں قوائے عملی سب بیدار
ہے اسی مے سے یہ سرمستیِ احرارِ وطن
ہے اسی نشے سے یہ گرمیِ ہنگامۂ کار
مدتوں بحثِ سیاست کی اجازت ہی نہ تھی
کہ وفاداریِ مسلم کا تھا یہ خاص شعار
اب اجازت ہے مگر دائرۂ بحث ہے یہ
کہ گورنمنٹ سے اس بات کے ہو عرض گزار
ہم کو پامال کیے دیتے ہیں ابنائے وطن
ڈر ہے پس جائے نہ یہ فرقۂ اخلاص شعار
یہ بھی اک گونہ شکایت ہے غلاموں کو ضرور
کہ مناصب میں ہے کم حلقہ بگوشوں کا شمار

سُرور جہان آبادی

1873 —— 1910

منشی درگا سہائے سرور جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم قصبے کے تحصیل اسکول میں ہوئی۔ شاعری کا شوق بھی اسی وقت سے ہوا۔ شروع میں وحشت تخلص کرتے تھے۔ 1899 سے آپ کا کلام ادبی رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہونے لگا۔ سرور شاعری کے طرز جدید کے حامیوں میں تھے۔ چنانچہ شاعری میں انھوں نے حالی اور اسمٰعیل ہی کی راہ اختیار کی۔ سرور کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں۔ جام سرور جس میں غزلیں اور قطعات وغیرہ ہیں اور خمخانۂ سرور جس میں صرف نظمیں ہیں۔

گلزار وطن

پھولوں کا کنجِ دلکش بھارت میں اک بنائیں
حبِ وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں

پھولوں میں جس چمن کے ہو بوئے جاں نثاری
حبِ وطن کی قلمیں ہم اس چمن سے لائیں

خونِ جگر سے سینچیں ہر نخلِ آرزو کو
اشکوں سے بیل بوٹوں کی آبرو بڑھائیں

ایک ایک گل میں پھونکیں روحِ شمیمِ وحدت
اک اک کلی کو دل کے دامن سے دیں ہوائیں

فردوس کا نمونہ اپنا ہو کنجِ دلکش
سارے جہاں کی جس میں ہوں جلوہ گر فضائیں

چھایا ہو ابرِ رحمت کاشانۂ چمن میں
رم جھم برس رہی ہوں چاروں طرف گھٹائیں

مرغانِ باغ بن کر اڑتے پھریں ہوا میں
نغمے ہوں روح افزا اور دلربا صدائیں

حبِ وطن کے لب پر ہوں جاں فزا ترانے
شاخوں پہ گیت گائیں پھولوں پہ چہچہائیں

چھائی ہوئی گھٹا ہو موسم طرب فزا ہو
جھونکے چلیں ہوا کے اشجار لہلہائیں

اس کنجِ دل نشیں میں قبضہ نہ ہو خزاں کا
جو ہو گلوں کا تختہ، تختہ ہو اک جناں کا

بلبل کو ہو چمن میں صیاد کا نہ کھٹکا
خوش خوش ہو شاخِ گل پر غم ہو نہ آشیاں کا

حبِ وطن کا مل کر سب ایک راگ گائیں
لہجہ جدا ہو گرچہ مرغانِ نغمہ خواں کا

ایک ایک لفظ میں ہو تاثیر بوئے الفت
انداز دل نشیں ہو ایک ایک داستاں کا

مرغانِ باغ کا ہو اس شاخ پر نشیمن
پہنچے نہ ہاتھ جس تک صیادِ آسماں کا

موسم ہو جوشِ گل کا اور دن بہار کے ہوں
عالم عجیب دلکش ہو اپنے گلستاں کا

مل مل کے ہم ترانے حبِ وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں

اقبال

1873 ——1938

ڈاکٹر محمد اقبال سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔علوم مشرقی اور فارسی وعربی کی تعلیم شمس العلما مولوی سید میر حسن سے حاصل کی۔ایف اے سیالکوٹ کالج اور بی اے اور ایم اے لاہور کالج سے کیا۔سر طامس آرنلڈ سے فلسفہ سیکھا۔آرنلڈ نے انگلستان جانے کے بعد اقبال کو بھی 1905 میں انگلستان بلایا۔وہاں آرنلڈ، براؤن، نکلس، سارلی وغیرہ سے کسب فیض کیا۔کیمبرج یونیورسٹی سے فارغ ہوکر جرمنی گئے اور وہاں ڈاکٹری کی ڈگری لی۔ 1901 میں اقبال کی پہلی نظم ''ہمالیہ'' مخزن میں چھپی۔ اردو شاعری کا سلسلہ جاری رہا اور کلام کا پہلا مجموعہ ''بانگِ درا'' کے نام سے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ 1935 میں بال جبریل اور تیسرا مجموعہ 1936 میں ضرب کلیم کے نام سے شائع ہوا۔آخری مجموعہ رحلت کے بعد ارمغانِ حجاز کے نام سے چھپا ہے۔ان کے علاوہ فارسی کے کئی مجموعے ہیں۔اقبال کا انتقال 21/اپریل 1938 کو لاہور میں ہوا۔ جہاں تک اقبال کی شاعری کا تعلق ہے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آج کل اردوداں پبلک پر جس شخص کا سب سے زیادہ اثر ہے وہ اقبال ہے۔

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں — گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو — اترا ترے کنارے جب کاررواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

ہندوستانی بچوں کا قومی گیت

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا — نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا — جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کردیا تھا — سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا

مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا — ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے

وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا
نوحِ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا

رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

غلاموں کی نماز

ترکی وفد ہلالِ احمر لاہور میں

کہا مجاہدِ ترکی نے مجھ سے بعدِ نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمھارے امام؟
وہ سادہ مردِ مجاہد وہ مومنِ آزاد
خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام!
ہزار کام ہیں مردانِ حر کو دنیا میں
انھی کے ذوقِ عمل سے ہیں اُمتوں کے نظام
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے مرور غلاموں کے روز و شب پہ حرام!
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام!
خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

ظفر علی خاں

پیدائش 1871

مولانا ظفر علی خاں کرم آباد تحصیل وزیر آباد پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ ابتدائی تعلیم وزیر آباد اور پٹیالہ میں حاصل کی۔ علی گڑھ کالج سے بی۔اے کی ڈگری لی اور بمبئی چلے گئے۔ بمبئی میں مولانا شبلی سے حیدر آباد کے حالات سنے اور حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں داغ سے کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد لاہور سے اخبار زمیندار نکالا۔ اخبار نویسی مستقل شغل ہے۔ کراچی سشن (31ء) تک کانگریس میں شریک رہے۔ اس کے بعد نیلی پوش تحریک شروع کی اور مجلسِ احرار سے تعاون کیا۔ آج کل مسلم لیگ کے سرگرم لیڈر ہیں۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ بہارستان کے نام سے چھپ چکا ہے۔ مولانا کا بیشتر کلام سیاسی اور مذہبی ہے۔

طاقتِ ایمان

وطن کو میں چمنستاں بنا کے چھوڑوں گا
اور اس کی صبح کو خنداں بنا کے چھوڑوں گا
ہر ایک وقت کے دارا کو اور سکندر کو
میں اپنے قصر کا درباں بنا کے چھوڑوں گا
لہو شہید کا لوں گا اور اس کی سرخی کو
میں غازۂ رخِ ایماں بنا کے چھوڑوں گا
وہ مشکلیں جنھیں حل جبر کر نہیں سکتا!
بزورِ صبر انھیں آساں بنا کے چھوڑوں گا

ہندوستان

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق، تو ہندوستاں سے ہے
تہذیبِ ہند کا نہیں چشمہ اگر ازل
یہ موجِ رنگ رنگ پھر آئی کہاں سے ہے
ذرّے میں گر تڑپ ہے تو اس خاکِ پاک سے
سورج میں روشنی ہے تو اس آسماں سے ہے
ہے اس کے دم سے گرمیِ ہنگامۂ جہاں
مغرب کی ساری رونق اسی اک دکاں سے ہے

تخت یا تختہ

نکہتِ گل کے عوض دوشِ صبا پر اب کی بار
بوئے جاں گلشن میں لائی ہے بہارِ انقلاب
وضعِ عالم میں تغیر کے ہویدا ہیں نشاں
جوش میں ہے جذبۂ بے اختیارِ انقلاب
پھوٹنے والی ہے آزادی کے سورج کی کرن
اٹھ رہا ہے پردۂ شب ہائے تارِ انقلاب

خیرہ ہو جانے کو ہے بینائی استبداد کی — سر پہ آ چمکی ہے تیغِ آبدار انقلاب
سر بکف میداں میں آ پہنچے جوانانِ وطن — جن کی قربانی پہ ہے دارو مدار انقلاب
خاک میں مل جائے گا سرمایہ داری کا غرور — گر یہی ہے گردشِ لیل و نہار انقلاب

وقت آپہنچا کہ یا مرجاؤ یا آزاد ہو!
تخت یا تختہ ہے حکمِ تاجدار انقلاب

انقلابِ ہند

بارہا دیکھا ہے تو نے آسماں کا انقلاب — کھول آنکھ اور دیکھ اب ہندوستاں کا انقلاب
مغرب و مشرق نظر آنے لگے زیر و زبر — انقلابِ ہند ہے سارے جہاں کا انقلاب
کر رہا ہے قصرِ آزادی کی بنیاد استوار — فطرتِ طفل و زن و پیر و جواں کا انقلاب

صبر والے چھا رہے ہیں جبر کی اقلیم پر
ہو گیا فرسودہ شمشیر و سناں کا انقلاب

آزادی کا بگل

بدلی ہے زمانے کی ہوا تم بھی بدل جاؤ — ہاتھ آ نہیں سکتا ہے گیا وقت، سنبھل جاؤ
حدت مگر اس درجہ رہے خوں میں کہ موسم — گر برف کے سانچے میں بھی ڈھالے تو پگھل جاؤ
محنت کے بلاخیز سمندر کے نہنگو — سرمایے کی مچھلی کو سموچا ہی نگل جاؤ
آزادیِ کامل کا علم ہاتھ میں لے کر — میداں میں بجاتے ہوئے ایماں کا بگل جاؤ

برطانیہ کی میز سے کچھ ریزے گریں گے
اے ٹوڈیو چننے تم انھیں پیٹ کے بل جاؤ

فانوسِ ہند کا شعلہ

زندہ باش اے انقلاب اے شعلۂ فانوسِ ہند
گرمیاں جس کی فروغِ منزلِ جاں ہو گئیں

بستیوں پر چھا رہی تھیں موت کی خاموشیاں
تو نے صور اپنا جو پھونکا محشر ستاں ہو گئیں

جتنی بوندیں تھیں شہیدانِ وطن کے خون کی
قصرِ آزادی کی آرائش کا ساماں ہو گئیں

مرحبا اے نو گرفتارانِ بیدادِ فرنگ
جن کی زنجیریں خروش افزائے زنداں ہو گئیں

زندگی ان کی ہے، دین ان کا ہے، دنیا ان کی ہے
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہو گئیں

شرابِ خانہ ساز

آزادیِ وطن کا پھریرا اڑائے جا
ہندوستاں کے نام کا ڈنکا بجائے جا

ہندو جو شیر ہوں تو مسلمان ہوں شکر
دونوں میں اتفاق کا رشتہ بڑھائے جا

خاشاکِ ذلتِ صد و پنجاہ سالہ کو
دریائے اتحاد کی رَو میں بہائے جا

رسوائیوں کے داغ سے آلودہ ہے جبیں
عزت کے چار چاند بھی اس میں لگائے جا

گردش میں لا پیالۂ مئے خانہ ساز کا
اور قسمتِ فرنگ کو چکر میں لائے جا

نوشتۂ تقدیر

تواناؤں کے بس میں ہے سداپائے حقارت سے
کروڑوں ناتوانوں کی تمناؤں کو ٹھکرانا
دبا دینا کسی مظلوم کی آہوں کو سینے میں
کسی بیکس کو ساری عمر آنسو خوں کے رلوانا
ہے جن کے دل میں آزادی کی دھن ان نوجوانوں کو
وطن کے عشق کی پاداش میں سولی پہ لٹکانا
بہا دینا کسی کی راکھ کو ستلج کی موجوں میں
کسی کی لاش اٹک کے پار خاک اور خوں میں تڑپانا
ملوکیت پرستوں کے لیے یہ سب کچھ آساں ہے
مگر دشوار ہے قانونِ فطرت کا بدل جانا
زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے
خود اپنی ہی رعایا سے پڑا ہے جس کو ٹکرانا

دعوتِ عمل

اگر تم کو حق سے ہے کچھ بھی لگاؤ
تو باطل کے آگے نہ گردن جھکاؤ
حکومت کو تم نے لیا آزما
اب اپنے مقدر کو بھی آزماؤ
ہو تم جس کے ذرّے وہ ہے خاکِ ہند
چھپے ہیں جو اس میں وہ جوہر دکھاؤ
فلک پر مہ و مہر پڑجائیں ماند
زمیں پر اس انداز سے جگمگاؤ
ہمالہ بھی آجائے گر راہ میں
تو ٹھکرا کے آگے سے اس کو ہٹاؤ
کرے تم سے گنگا بھی گر بے رخی
پلٹ کر الٹ دو تم اس کا بہاؤ

زمانہ میں روشن کرو نامِ ہند ہر اقلیم میں اس کا سکہ چلاؤ
ہر اک ملک کا ہاتھ میں لے کے دل ہر اک قوم سے اپنی عزت کراؤ
پسینہ گرے ہندوؤں کا جہاں وہاں تم مسلمان کا خون بہاؤ
زمیں ہو جب اس خون سے لالہ زار تو اس پر بساطِ اخوت بچھاؤ
پرانا ہوا دفتری اقتدار سمجھ لو اب اس کا بھی ہے چل چلاؤ
کسی روز خود غرق ہو جائے گی
بہت بہہ چکی ہے یہ کاغذ کی ناؤ

چکبست

1882——1926

پنڈت برج نرائن چکبست فیض آباد میں پیدا ہوئے مگر چند ہی سال بعد لکھنؤ چلے آئے اور یہیں تعلیم پائی۔ 1905 میں کیننگ کالج سے بی۔اے کی ڈگری لی اور 1908 میں قانون کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کی اور لکھنو کے ممتاز وکیلوں میں شمار ہونے لگے۔12 رفروری 1926 کو ایک مقدمے میں رائے بریلی گئے۔ واپسی میں اسٹیشن پر ریل گاڑی میں بیٹھتے ہی فالج گرا اور شام میں سات بجے وہیں انتقال کیا۔ پہلی غزل نو برس کی عمر میں کہی تھی۔ آتش، غالب اور انیس کے کلام کے شیدا تھے چنانچہ غزلوں میں آتش اور مسدس میں انیس کا اثر جھلکتا ہے۔ چکبست بڑے اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ صبح وطن کے نام سے چھپ چکا ہے۔ چکبست کے کلام پر وطنیت کا رنگ غالب ہے لیکن ان کا آزادی اور وطنیت کا تصور وہی ہے جو آج سے بیس سال پہلے تقریباً ہر وطن پرست کا تھا یعنی برطانیہ کے سایے میں رہ کر ہوم رول حاصل کرنا۔ چکبست کا کلام اپنے عہد کے ذہنی ارتقا اور سیاسی رفتار کا سچا نمونہ ہے۔

خاکِ ہند

1905

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے　　دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے　　اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری　　چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری　　چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو　　سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو　　سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے　　اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے　　فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں　　کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں　　پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمعِ انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حبِّ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا   دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا   اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حبِّ قومی اس خواب سے جگا دے   بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے   اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک   رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک   ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا   آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کہن کا   تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے، اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

1916

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن محبت کی آنکھوں کا تارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ اس کے درختوں کی تیاریاں وہ پھل پھول پودے وہ پھلواریاں
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

ہوا میں درختوں کا وہ جھومنا وہ پتوں کا پھولوں کا منہ چومنا
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ ساون میں کالی گھٹا کی بہار وہ برسات کی ہلکی ہلکی پھوہار
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ باغوں میں کوئل وہ جنگل کے مور وہ گنگا کی لہریں وہ جمنا کا زور
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

اسی سے ہے اس زندگی کی بہار وطن کی محبت ہو یا ماں کا پیارا
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

حسرت

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کی عمر اس وقت 65 سال کے لگ بھگ ہے۔ حسرت قصبہ موہان ضلع اوناؤ کے رہنے والے ہیں حسرت خالص غزل گو شاعر ہیں اور دورِ جدید کے غزل گویوں کی اگلی صف میں شمار ہوتے ہیں۔ غزلیات کا پہلا مجموعہ 1914 میں چھپا۔ علی گڑھ کالج کے گریجویٹ ہیں۔ ان کی ساری عمر ادبی خدمت اور وطن کو آزاد کرانے کی کوشش میں گزری ہے۔ علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں ایک رسالہ اردوئے معلیٰ کے نام سے نکالتے تھے۔ حسرت قومی تحریک میں جیل بھی جا چکے ہیں۔

نجاتِ ہند

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمتِ سر بلند سے یاس کا انسداد کر
قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیِ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر
حق سے بہ عذرِ مصلحت وقت پہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر
خدمتِ اہلِ جور کو کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر
غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

جوش ملیح آبادی

شبیر حسن خاں جوش 1896 میں ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ شاعری باپ دادا سے ورثے میں ملی چنانچہ جوش بھی نو دس برس کی عمر ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ ابتدا میں غزلیں کہیں اور عزیز لکھنوی سے اصلاح لی۔ پھر نظمیں کہنے لگے۔ دس گیارہ سال حیدر آباد میں دارالترجمہ کے رکن رہے وہاں سے دہلی گئے اور ایک ماہانہ رسالہ کلیم جاری کیا۔ ایک سال سے اپنے وطن ملیح آباد میں مقیم ہیں۔ رسالہ کلیم رسالہ نیا ادب میں ضم ہوگیا ہے اور جوش اس نئے رسالے کے جس کا نام نیا ادب ہے چیف ایڈیٹر ہیں۔ کلام کا پہلا مجموعہ 1926 میں روح ادب کے نام سے چھپا۔ اب تک پانچ مجموعے اور چھپ چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ شعلہ و شبنم، نقش و نگار، جنون و حکمت، فکر و نشاط اور حرف و حکایت۔ جوش ان دنوں ارتقائے انسانی پر ایک طویل نظم لکھ رہے ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے کلام نے دور حاضر کے ہر نوجوان شاعر کو متاثر کیا ہے۔ جوش عہد حاضر کے سب سے زیادہ مقبول اور ترقی پسند شاعر ہیں۔

وطن[1]

1918

اے وطن پاک وطن روحِ روانِ احرار اے کہ ذرّوں میں ترے بوئے چمن، رنگِ بہار
اے کہ خوابیدہ تری خاک میں شاہانہ وقار اے کہ ہر خار ترا روکشِ صدروئے نگار

ریزے الماس کے تیرے خس و خاشاک میں ہیں
ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تری خاک میں ہیں

پالی غنچوں میں ترے رنگ کی دنیا ہم نے تیرے کانٹوں سے لیا درسِ تمنا ہم نے
تیرے قطروں سے سنی قراءتِ دریا ہم نے تیرے ذرّوں میں پڑھی آیتِ صحرا ہم نے

کیا بتائیں کہ تری بزم میں کیا کیا دیکھا
ایک آئینے میں دنیا کا تماشا دیکھا

تیری ہی گردنِ رنگیں میں ہیں باہیں اپنی تیرے ہی عشق میں ہیں صبح کی آہیں اپنی
تیرے ہی حسن سے روشن ہیں نگاہیں اپنی کج ہوئیں تیری ہی محفل میں کلاہیں اپنی

بانکپن سیکھ لیا عشق کی افتادوں سے
دل لگایا بھی تو تیرے ہی پری زادوں سے

پہلے جس چیز کو دیکھا، وہ فضا تیری تھی پہلے جو کان میں آئی وہ صدا تیری تھی
پالنا جس نے ہلایا، وہ ہوا تیری تھی جس نے گہوارے میں چوما وہ صبا تیری تھی

اوّلیں رقص ہوا مست گھٹا میں تیری
بھیگی ہیں اپنی مسیں آب و ہوا میں تیری

---

[1] میں تمام نوعِ انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں، وطنیت کے اُس ناپاک تخیل کو جو خودغرضی تنگ نظری، منافرت اور ابنِ آدم کی تقسیم چاہتا ہے، انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں، لیکن اس قدر وطنیت میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کی درندگی سے محفوظ رکھا جائے۔ (جوش)

اے وطن آج سے کیا ہم ترے شیدائی ہیں　　　آنکھ جس دن سے کھلی، تیرے تمنائی ہیں
مدتوں سے ترے جلووں کے تماشائی ہیں　　　ہم تو بچپن سے ترے عاشق وسودائی ہیں

بھائی طفلی سے ہر اک آن جہاں میں تیری
بات تتلا کے جو کی بھی تو زباں میں تیری

حسن تیرے ہی مناظر نے دکھایا ہم کو　　　تیری ہی صبح کے نغموں نے جگایا ہم کو
تیرے ہی ابر نے جھولوں میں جھلایا ہم کو　　　تیرے ہی پھولوں نے نوشاہ بنایا ہم کو

خندۂ گل کی خبر تیری زبانی آئی
تیرے باغوں میں ہوا کھا کے جوانی آئی

تجھ سے منہ موڑ کے منہ اپنا دکھائیں گے کہاں؟　　　گھر جو چھوڑیں گے تو پھر چھاؤنی چھائیں گے کہاں
بزمِ اغیار میں آرام یہ پائیں گے کہاں　　　تجھ سے ہم روٹھ کے جائیں گے تو جائیں گے کہاں

تیرے ہاتھوں میں ہے قسمت کا نوشتہ اپنا
کس قدر تجھ سے بھی مضبوط ہے رشتہ اپنا

اے وطن! جوش ہے پھر قوتِ ایمانی میں　　　خوف کیا دل کو، سفینہ ہے جو طغیانی میں
دل سے معروف ہیں ہر طرح کی قربانی میں　　　محو ہیں جو تری کشتی کی نگہبانی میں

غرق کرنے کو جو کہتے ہیں زمانے والے
مسکراتے ہیں تری ناؤ چلانے والے

ہم زمیں کو تری ناپاک نہ ہونے دیں گے　　　تیرے دامن کو کبھی چاک نہ ہونے دیں گے
تجھ کو، جیتے ہیں تو، غم ناک نہ ہونے دیں گے　　　ایسی اکسیر کو یوں خاک نہ ہونے دیں گے

جی میں ٹھانی ہے یہی، جی سے گزر جائیں گے
کم سے کم، وعدہ یہ کرتے ہیں کہ مر جائیں گے

شکستِ زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا ،آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے ،توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے،بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے ، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی ،زیرو زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مارِ سیہ ،برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی ، سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی ، ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو، کہ وہ زنداں گونج اٹھا ،جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں ، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

لمحۂ آزادی

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی   ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر   غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

آثارِ انقلاب

قسم اس دل کی، چسکا ہے جسے صہبا پرستی کا
یہ دل پہچانتا ہے جو مزاجِ اشیائے ہستی کا

قسم ان تیز کانوں کی کہ ہنگامِ قدح نوشی
سنا کرتے ہیں جو راتوں کو بحر و بر کی سرگوشی

قسم اس روح کی، خو ہے جسے فطرت پرستی کی
سنا کرتی ہے راتوں کو جو ضربیں قلبِ ہستی کی

قسم اس ذوق کی، حاوی ہے جو آثارِ قدرت پر
ضمیرِ کائنات، آئینہ ہے جس کی لطافت پر

قسم اس حس کی، جو پہچان کر تیور ہواؤں کے
سناتی ہے خبر طوفان کی، طوفان سے پہلے

قسم اس نور کی، کشتی جوان آنکھوں کی کھیتا ہے
جو نقشِ پا کے اندر عزمِ رہرو دیکھ لیتا ہے

قسم اس فکر کی، سوگند اس تخئیلِ محکم کی
جو سنتی ہے صدائیں جنبشِ مژگانِ عالم کی

قسم اس آنکھ کی جو درسِ بینش مجھ کو دیتی ہے
زمیں کی بھاپ میں جو بجلیوں کو دیکھ لیتی ہے

قسم اس روح کی جو عرش کو رفعت سکھاتی ہے
کہ راتوں کو مرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے

"اٹھو وہ صبح کا غرفہ کھلا، زنجیرِ شب ٹوٹی
وہ دیکھو پو پھٹی، غنچے کھلے، پہلی کرن پھوٹی

اٹھو، چونکو، بڑھو، منھ ہات دھو، آنکھوں کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو"

اللہ کرے

اللہ کرے اے ہند! اس فتنۂ دوراں میں
ہو گوئے ظفر مندی تیرے خم چوگاں میں

کانٹوں کو بناتی ہے جو بادِ صبا گلشن
آئے وہ صبا تیرے اجڑے ہوے بستاں میں

دل ملتے ہیں جس مے سے، معبود! وہ مے ٹپکا
پیمانۂ ہندو میں، مینائے مسلماں میں

راتوں کو چمکتے ہیں سینے میں جو شاعر کے
وہ عقدہ کشا غنچے مہکیں ترے داماں میں

اوراق سے اڑ جائیں اغیار کی تحریریں
اب مُہر تری جھلکے ہر دفتر و دیواں میں

ہاں نوح کی کشتی کی تقدیر ملے تجھ کو
اس بحرِ سیاست کے بپھرے ہوئے طوفاں میں

اے طاقِ وطن! تجھ میں اے کاش پرافشاں ہو
وہ نور کہ غلطاں تھا قندیلِ سلیماں میں

اے کاش کبھی تیری ظلمت کی طرف دیکھے
وہ شمع کہ روشن ہے عشرت کدۂ یزداں میں

ساقی کے تبسم سے، اور جوش کے بربط سے
روشن ہو کنول تیری محرابِ زرافشاں میں

وفادارانِ ازلی کا پیام
شاہنشاہِ ہندوستاں کے نام

تاج پوشی کا مبارک دن ہے اے عالم پناہ
اے غریبوں کے امیر، اے مفلسوں کے بادشاہ
اے گداپیشوں کے سلطاں، جاہلوں کے تاجدار
بے زروں کے شاہ، دریوزہ گروں کے شہریار
اے ہمارے عالموں کے "حامیِ دینِ مبیں"
دورِ سید کے اولی "اولی اولی الامر" و "امیرالمومنیں"
اے رئیسِ پاک دل اے شہریارِ نیک نام
بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کا لیجیے سلام
راس کل آئی تھی جیسے آپ کے ماں باپ کو
یوں ہی رسمِ تاج پوشی ہو مبارک آپ کو
دل کے دریا نطق کی وادی میں بہہ سکتے نہیں
آپ کی ہیبت سے ہم کچھ کھل کے کہہ سکتے نہیں
لیکن اتنا ڈرتے ڈرتے عرض کرتے ہیں ضرور
ہند سے واقف کیے جاتے نہیں شاید حضور
آپ کے ہندوستاں کے جسم پر بوٹی نہیں
تن پر اک دھجی نہیں ہے، پیٹ کو روٹی نہیں
تاج پوشی نے جو دی ہیں بھیک میں دو روٹیاں
شکریہ ان روٹیوں کا اے شہِ گردوں نشاں

روٹیاں لیکن جو دی ہیں آپ کے خدّام نے
آسکیں گی کیا یہ کل کی اشتہا کے سامنے؟
آج کی دو روٹیوں سے چین ہم پائیں گے کیا
کھا بھی لیں گے آج اگر ڈٹ کر تو کل کھائیں گے کیا؟
صرف سڑکوں کے چراغاں سے نہیں چلتا ہے کام
کچھ دلوں کی روشنی کا بھی کیا ہے اہتمام؟
آپ کے پرچم کے نیچے ہے جو قومِ نامراد
کھائے جاتا ہے اسے خدّامِ عالی کا عناد
معدہ محرومِ غذا ہے ، کیسہ ہے محرومِ زر
آپ کے عمّال نے لوٹا ہے ہم کو اس قدر
آپ کے فرقِ مبارک کو دیا ہے جس نے تاج
آج اس بھارت کا سر ہے،اور تیغِ احتیاج
ہر جبیں پر ہے شکن،اس کج کلاہی کی قسم
ہر مکاں اک مقبرہ ہے قصرِ شاہی کی قسم
آپ کے سر پر ہے تاج ، اے فاتحِ روئے زمیں
اور ہم اہلِ وفا کے پاؤں میں جوتی نہیں
ہم وفا کیش،آپ کی نظروں سے بھی گر جائیں گے؟
آپ بھی ہم سے خدا کی طرح کیا پھر جائیں گے؟
ہم سے ، باغی قسم کے افراد کہتے ہیں یہ بات
صرف موسیٰ بن کے فرعونوں سے ممکن ہے نجات
ہم تو موسیٰ بن نہیں سکتے کسی تدبیر سے
پھر بھی خائف ہیں سیاسی خواب کی تعبیر سے
نوجواں بپھرے ہوئے ہیں، بھوک سے دل تنگ ہیں
ذرّے ذرّے سے عیاں آثار حرب وجنگ ہیں
کشورِ ہندوستاں میں رات کو ہنگامِ خواب

کروٹیں رہ رہ کے لیتا ہے فضا میں انقلاب
گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ
آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ!
ہم وفادارانِ پیشیں ،ہم غلامانِ کہن
قبر جن کی کھد چکی، تیار ہے جن کا کفن
تندرو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں
نوجوانوں کی امنگوں کو دبا سکتے نہیں
مدح اب ڈر ڈر کے ہم کرتے ہیں یوں سرکار کی
جیسے کوئی دھار چھوتا ہو اپنی تلوار کی
وہ سرنگیں کھد رہی ہیں، الحفیظ والاماں
صرف انگلستان کیا ،یورپ سا جائے جہاں
نوجواں کرتے ہیں جب سرگوشیاں پیکار کی
صاف آتی ہے صدا چلتی ہوئی تلوار کی
آپ کے ایوان میں رقصاں ہیں لپٹیں عود کی
ہندیوں کی سانس سے آتی ہے بو بارود کی
غور سے سن لیجیے اے خواجۂ عالی نژاد
آپ کو دھوکے میں رکھ سکتے نہیں ہم خانہ زاد
کیجئے درماں میں عجلت ،ورنہ دل ڈر جائیں گے
حاکم اپنے گھر چلے جائیں گے ، ہم مرجائیں گے
چونکیے جلدی ،ہوائے تند و گرم آنے کو ہے
ذرہ ۔ ذرہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

خونی بینڈ

روح بے چین ہے، خاموش ہوا ے فوج کے بینڈ
اس طرح صبح کی مخمور ہواؤں میں نہ اینڈ
تجھ میں آواز ہے فولاد شکن تیروں کی
سنسناہٹ ہے لچکتی ہوئی شمشیروں کی
کتنی ماؤں کے کلیجے کی ہیں قاشیں تجھ میں
کتنے مہ پارہ جوانوں کی ہیں لاشیں تجھ میں
کتنی روندی ہوئی لاشوں کی ہے سردی تجھ میں
کتنی بیواؤں کے چہرے کی ہے زردی تجھ میں
کتنی خوابیدہ ہیں مایوس نگاہیں تجھ میں
کتنے معصوم یتیموں کی ہیں آہیں تجھ میں
تیرا ہرراگ ہے ڈوبا ہوا چشمِ نم میں !
رقصِ خونیں کی دھمک ہے ترے زیرو بم میں
سسکیاں تجھ میں غلطیدہ دل افگاروں کی
کروٹیں موت کی ہیں گت میں ترے تاروں کی
تیری ہر تان میں پوشیدہ ہیں لاکھوں آنسو
تیری آواز میں غلطاں ہے جوانوں کا لہو
گم ہیں رستے ہوئے زخموں کی بہاریں تجھ میں
خنجروں کی ہیں مچلتی ہوئی دھاریں تجھ میں
نغمہ ہے لے میں تری خون کے فواروں کا
زمزمہ تجھ میں ہے چلتی ہوئی تلواروں کا

تیری آواز جب احساس پہ چھا جاتی ہے
موت کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے!

تاج کا سایہ

ایک ظلمت سی آرہی ہے نظر
آج ہندوستاں کے ماتھے پر
لیکن اے ناشناسِ لیل و نہار
تیرہ بختی کے یہ نہیں آثار
بلکہ قدرت نے بادلِ خرسند
'تاج کو تا بہ سر کیا ہے بلند
یہ جو ظلمت سی آج طاری ہے
سایۂ تاجِ شہر یاری ہے

حفیظ جالندھری

حفیظ ۱۹۰۰ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے اور گرامی سے اصلاح لیتے رہے۔ حفیظ کا تعلق رسالہ مخزن مرحوم سے بھی تھا۔ حفیظ کا پہلا مجموعۂ کلام ''نغمہ زار'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے بعد ''شاہنامۂ اسلام'' لکھنا شروع کیا جس کی تین جلدیں چھپ چکی ہیں۔ سیرِ کشمیر ایک طویل نظم ہے جس میں انھوں نے اہلِ کشمیر کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ ایک مجموعہ ''سوز و ساز'' کے نام سے چھپا۔ حفیظ نے کثرت سے گیت بھی لکھے ہیں۔

آزادی

شیروں کو آزادی ہے آزادی کے پابند رہیں
جس کو چاہیں چیریں، پھاڑیں، کھائیں، پئیں، آنند رہیں

سانپوں کو آزادی ہے ہر بستے گھر میں بسنے کی
ان کے سر میں زہر بھی ہے اور عادت بھی ہے ڈسنے کی

شاہیں کو آزادی ہے، آزادی سے پرواز کرے
ننھی منی چڑیوں پر جب چاہے مشقِ ناز کرے

پانی میں آزادی ہے گھڑیالوں اور نہنگوں کو
جیسے چاہیں پالیں پوسیں اپنی تند امنگوں کو

انساں نے بھی شوخی سیکھی وحشت کے ان رنگوں سے
شیروں، سانپوں، شاہینوں، گھڑیالوں اورنہنگوں سے

انساں بھی کچھ شیر ہیں باقی بھیڑوں کی آبادی ہے
بھیڑیں سب پابند ہیں لیکن شیروں کو آزادی ہے

شیر کے آگے بھیڑیں کیا ہیں اک من بھاتا کھاجا ہے
باقی ساری دنیا پر جا شیر اکیلا راجا ہے

بھیڑیں لاتعداد ہیں لیکن سب کو جان کے لالے ہیں
ان کو یہ تعلیم ملی ہے بھیڑیے طاقت والے ہیں

ماس بھی کھائیں، کھال بھی نوچیں، ہردم لاگو جانوں کے
بھیڑیں کاٹیں دورِ غلامی بل پر گلہ بانوں کے

بھیڑیوں ہی سے گویا قائم امن ہے اس آبادی کا
بھیڑیں جب تک شیر نہ بن لیں نام نہ لیں آزادی کا

انسانوں میں سانپ بہت ہیں قاتل بھی زہر یلے بھی

ان سے بچنا مشکل ہے آزاد بھی ہیں بے تیغے بھی
سانپ تو بننا مشکل ہے اس خصلت سے معذور ہیں ہم
منتر جاننے والوں کی محتاجی پہ مجبور ہیں ہم

شاہیں بھی ہیں، چڑیاں بھی ہیں انسانوں کی بستی میں
وہ نازاں ہیں رفعت پہ یہ نالاں اپنی پستی میں
شاہیں کو تادیب کرو یا چڑیوں کو شاہین کرو
یوں اس باغِ عالم میں آزادی کی تلقین کرو

بحرِ جہاں میں ظاہر و پنہاں انسانی گھڑیال بھی ہیں
طالبِ جان وجسم بھی ہیں شیدائے جاہ ومال بھی ہیں
یہ انسانی بستی کو سونے کی مچھلی جانتے ہیں
مچھلی میں بھی جان ہے لیکن ظالم کب گردانتے ہیں

سرمائے کا ذکر کرو ' مزدور کی ان کو فکر نہیں
مختاری پر مرتے ہیں مجبور کی ان کو فکر نہیں
آج یہ کس کا منہ ہے آئے منہ سرمایہ داروں کے
ان کے منہ میں دانت نہیں پھل ہیں خونی تلواروں کے

کھاجانے کا کون سا گر ہے جو ان سب کو یاد نہیں
جب تک ان کو آزادی ہے کوئی بھی آزاد نہیں
زر کا بندہ عقل و خرد پر جتنا چاہے ناز کرے
زیرِ زمیں دھنس جائے یا بالائے فلک پرواز کرے

اس کی آزادی کی باتیں ساری جھوٹی باتیں ہیں
مزدوروں کو مجبوروں کو کھاجانے کی گھاتیں ہیں
جب تک چوروں راہزنوں کا ڈر دنیا پر غالب ہے
پہلے مجھ سے بات کرے جو آزادی کا طالب ہے

جگر مرادآبادی

چشم کشا و جانبِ رزم گہِ وطن نگر

خیز و بیا، نظارہ کن، دل ہمہ پارہ پارہ کن
شوکتِ رفتہ راجو، عبرتِ انجمن نگر

جسم زفاقہ زار زار، روح زدرد بے قرار
مادرِ ہند اشکبار مفلسیِ وطن نگر

وجہ زمفلسی مپرس، سیم و زرِ وطن مجو
رخ بنما بہ لندن و سیم و زرِ وطن نگر

جرم و خطا روایتے، عذر و دغا حکایتے
جورِ فرنگیاں مپرس، دار ہمیں رسن نگر

گاہ بروئے معدلت، شانِ نظر نظر ہمیں
گہ بہ جبینِ خسروی، طرزِ شکن شکن نگر

گاہ بیا بہ شہر و دیہہ، شورشِ دار و گیر بیں
گاہ برو بہ سرحد و اذنِ بزن بزن نگر

جدّتِ افتراق بیں، ندرتِ انشقاق بیں
فطرتِ چست و چاق بیں، حکمتِ علم و فن نگر

شانِ امارتے ہمیں، طرزِ سیاستے ہمیں
ایں ہمہ نعمتے ہمیں، واں ہمہ بر وطن نگر

گاہ بہ لب شکایتے، گہ زغلام زادگاں
دعویِ آشتی شنو، نازشِ حسنِ ظن نگر

ساغرِ جہد نوش کن، طاعتِ مے فروش کن
باز روش روش خرام، باز چمن چمن نگر

افسر میرٹھی

وطن کا راگ

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
ہر رت ہر اک موسم اس کا کیسا پیارا پیارا ہے
کیسا سہانا کیسا سندر پیارا دیس نہ ہمارا ہے
دکھ میں، سکھ میں، ہر حالت میں بھارت دل کا سہارا ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

سارے جگ کے پہاڑوں میں بے مثل پہاڑ ہمالہ ہے
پربت سب سے اونچا ہے یہ پربت سب سے نرالا ہے
بھارت کی رکھشا کرتا ہے، بھارت کا رکھوالا ہے
لاکھوں چشمے بہتے ہیں اس میں، لاکھوں ندیوں والا ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

گنگا جی کی پیاری لہریں گیت سناتی جاتی ہیں
صدیوں کی تہذیب ہماری یاد دلاتی جاتی ہیں
بھارت کے گلزاروں کو سرسبز بناتی جاتی ہیں
کھیتوں کو ہریالی دیتی پھول کھلاتی جاتی ہیں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

ہرے بھرے ہیں کھیت ہمارے، دنیا کو ان دیتے ہیں
چاندی سونے کی کانوں سے ہم جگ کو دھن دیتے ہیں
پریم کے پیارے پھول کی خوشبو گلشن گلشن دیتے ہیں
امن و اماں کی نعمت سب کو بھر بھر دامن دیتے ہیں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

کرشن کی بنسی نے پھونکی ہے روح ہماری جانوں میں
گوتم کی آواز بسی ہے محلوں میں میدانوں میں
چشتیؒ نے جو دی تھی مے وہ اب تک ہے پیمانوں میں
نانک کی تعلیم ابھی تک گونج رہی ہے کانوں میں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

مذہب کچھ ہو ہندی ہیں ہم سارے بھائی بھائی ہیں
ہندو ہیں یا مسلم ہیں یا سکھ ہیں یا عیسائی ہیں
پریم نے سب کو ایک کیا ہے پریم کے ہم شیدائی ہیں
بھارت نام کے عاشق ہیں ہم بھارت کے سودائی ہیں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

اختر شیرانی

لوری

کبھی تو رحم پر آمادہ بے رحم آسماں ہوگا کبھی تو یہ جفا پیشہ مقدر مہرباں ہوگا
کبھی تو سر پہ ابرِ رحمتِ حق گل فشاں ہوگا
مسرّت کا سماں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

کسی دن تو بھلا ہوگا غریبوں کی دعاؤں کا اثر خالی نہ جائے گا غم آلود التجاؤں کا
نتیجہ کچھ تو نکلے گا فقیرانہ صداؤں کا
خدا گر مہرباں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

خدا رکھے جواں ہوگا تو ایسا نوجواں ہوگا حسین و کارداں ہوگا دلیر و تیغ راں ہوگا
بہت شیریں زباں ہوگا بہت شیریں بیاں ہوگا
یہ محبوبِ جہاں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

وطن اور قوم کی سوجان سے خدمت کرے گا یہ خدا کی اور خدا کے حکم کی عزت کرے گا یہ
ہر اپنے اور پرائے سے سدا الفت کرے گا یہ
ہر اک پر مہرباں ہوگا
مرا ننھا جواں ہوگا

مرا منا بہادر ایک دن ہتھیار اٹھائے گا		سپاہی بن کے سوئے عرصہ گاہِ رزم جائے گا
وطن کے دشمنوں کے خون کی نہریں بہائے گا
اور آخر کامراں ہوگا
مرا منا جواں ہوگا

وطن کی جنگِ آزادی میں جس نے سر کٹایا ہے		یہ اس شیدائے ملت باپ کا پر جوش بیٹا ہے
ابھی سے عالمِ طفلی کا ہر انداز کہتا ہے
وطن کا پاسباں ہوگا
مرا منا جواں ہوگا

ہے اس کے باپ کے گھوڑے کو کب سے انتظار اس کا		ہے رستہ دیکھتی کب سے فضائے کارزار اس کا
ہمیشہ حافظ و ناصر رہے پروردگار اس کا
بہادر پہلواں ہوگا
مرا منا جواں ہوگا

وطن کے نام پر اک روز یہ تلوار اٹھائے گا		وطن کے دشمنوں کو کنجِ تربت میں سلائے گا
اور اپنے ملک کو غیروں کے پنجے سے چھڑائے گا
غرورِ خانداں ہوگا
مرا منا جواں ہوگا

صفِ دشمن میں تلوار اس کی جب شعلے گرائے گی		شجاعت بازوؤں میں برق بن کے لہلہائے گی
جبیں کی ہر شکن میں مرگِ دشمن تھرتھرائے گی
یہ ایسا تیغ راں ہوگا
مرا منا جواں ہوگا

سرِ میدان جس دم دشمن اس کو گھیرتے ہوں گے		بجائے خوں رگوں میں اس کی شعلے تیرتے ہوں گے
سب اس کے حملۂ شیرانہ سے منھ پھیرتے ہوں گے
تہ و بالا جہاں ہوگا
مرا منا جواں ہوگا

ساغر نظامی

عہد

جب طلائی رنگ سکّوں کو نچایا جائے گا
جب مری غیرت کو دولت سے لڑایا جائے گا
جب رگِ افلاس کو میری دبایا جائے گا
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
اور اپنے پاؤں سے انبارِ زر ٹھکراؤں گا

جب مجھے پیڑوں سے عریاں کر کے باندھا جائے گا
گرم آہن سے مرے ہونٹوں کو داغا جائے گا
جب دہکتی آگ پر مجھ کو لٹایا جائے گا
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
تیرے نغمے گاؤں گا اور آگ پر سو جاؤں گا

اے وطن جب تجھ پہ دشمن گولیاں برسائیں گے
سرخ بادل جب فضاؤں پر تری چھا جائیں گے
جب سمندر آگ کے بُرجوں سے ٹکر کھائیں گے
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
تیغ کی جھنکار بن کر مثلِ طوفاں آؤں گا

گولیاں چاروں طرف سے گھیر لیں گی جب مجھے
اور تنہا چھوڑ دے گا جب مرا مرکب مجھے
اور سنگینوں پہ چاہیں گے اٹھانا تب مجھے
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
مرتے مرتے اک تماشائے وفا بن جاؤں گا

خون سے رنگین ہو جائے گی جب تیری بہار — سامنے ہوں گی مرے جب سرد لعشیں بے شمار

جب مرے بازو پہ سر آکر گریں گے بار بار

اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

اور دشمن کی صفوں پر بجلیاں برساؤں گا

جب درِ زنداں کھلے گا برملا میرے لیے — انتہائی جب سزا ہوگی روا میرے لیے

ہر نفس جب ہوگا پیغامِ قضا میرے لیے

اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

بادہ کش ہوں زہر کی تلخی سے کیوں گھبراؤں گا

حکم آخر قتل گہ میں جب سنایا جائے گا — جب مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائے گا

جب یکا یک تختۂ خونی ہٹایا جائے گا

اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

عہد کرتا ہوں کہ میں تجھ پر فدا ہو جاؤں گا

ترانۂ وطن

اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من جانِ من جانِ من جانِ من

ذرّے ذرّے میں محفل سجا دیں گے ہم تیرے دیوار و در جگمگا دیں گے ہم
تجھ کو ہستی کا گلشن بنا دیں گے ہم آسمانوں پہ تجھ کو بٹھا دیں گے ہم

بن کے دشمن ترا جو اٹھے گا یہاں
اس کو تحت الثریٰ میں گرا دیں گے ہم
اور تحت الثریٰ کو فنا کے سمندر میں غرقاب کر کے بہا دیں گے ہم

اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن
سن لیں یہ انس و جان و زمین و زمن

سونے والوں کو اک دن جگا دیں گے ہم رسم و راہِ غلامی مٹا دیں گے ہم
بربریت کے ٹکڑے اڑا دیں گے ہم آسمان و زمیں کو ہلا دیں گے ہم

کون کہتا ہے کمزور نربل ہے تو
ہر طرف خوں کے دریا بہا دیں گے ہم
جس طرف سے پکارے گا ہندوستاں، اس طرف ہی وفا کی صدا دیں گے ہم

اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن
سر سے باندھے ہوئے ہیں ترنگا کفن
اے وطن اے وطن اے وتن اے وطن

تیری ہستی ہمالہ کی چوٹی بنی ماہ و خورشید کی اس پہ بندی لگی
روشنی شرق سے غرب تک ہو گئی سجدے میں جھک گئی عظمتِ زندگی

عظمت زندگی کی قسم ہے ہمیں
تیری عزت پہ سر تک کٹا دیں گے ہم
وقت آنے دے اے ماں ترے نام پر، اپنی ہستی و مستی مٹا دیں گے ہم
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن
خون سے اپنے بھر دیں گے گنگ و چمن
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

مست و خوشبو ہواؤں سے شیتل ہے تو مادھوری ہے، منوہر ہے، کومل ہے تو
پریم مدرا کی لبریز چھاگل ہے تو ہر عالم کے رحمت کا بادل ہے تو
آنکھ اٹھا کے جو دیکھا کسی نے تجھے
چھاؤنی اپنی لاشوں سے چھادیں گے ہم
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن
تجھ پہ قرباں زر و مال اور جان و تن
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

تیری ندیاں رسیلی مدھر، نغمہ خواں تیرے پربت تری عظمتوں کے نشاں
تیرے جنگل بھی ہنستے ہوئے گلستاں تیرے گلشن بھی رشکِ بہارِ جناں
زندہ باد اے غریبوں کے ہندوستاں
تیرا سکہ دلوں پر بٹھا دیں گے ہم
جو بھی پوچھے گا جنت کا ہم سے پتہ، راہِ کشمیر اس کو دکھا دیں گے ہم
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن
تو چمن در چمن ہے عدن در عدن
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

گلشنِ عیش و آرام و راحت ہے تو بے کسی میں کنارِ محبت ہے تو
بے بسوں اور غلاموں کی دولت ہے تو زندگی کے جہنم میں جنت ہے تو
سینچ کر خونِ دل سے تری کیاریاں
اور بھی تجھ کو جنت بنا دیں گے ہم

جو وہ گلچیں کہ صیاد دونوں کے سر تیرے قدموں پہ اک دن جھکا دیں گے ہم

اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

ہم ترے پھول ہیں تو ہمارا چمن

اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

جس کا پانی ہے امرت وہ مخزن ہے تو   جس کے دانے ہیں بجلی وہ خرمن ہے تو

جس کے کنکر ہیں ہیرے وہ معدن ہے تو   جس سے جنت ہے۔ دنیا وہ گلشن ہے تو

دیویوں دیوتاؤں کا مسکن ہے تو

تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنا دیں گے ہم

تیری الفت نہیں سارے سنسار میں تیری عظمت کا ڈنکا بجا دیں گے ہم

اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

یہ پھبن یہ وقار اور یہ بانکپن

اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

یہ ستارے یہ نکھرا ہوا آسماں   آسماں سے ہمالہ کی سرگوشیاں

ہے تری عظمتوں کا اٹل رازداں   مستقل، معتبر، محتشم، جاوداں

اس کی چوٹی سے دنیائے خونخوار کو

پھر پیامِ حیات وفا دیں گے ہم

پھر محبت کا نغمہ سنا دیں گے ہم، پھر زمانے کو جینا سکھا دیں گے ہم

اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

زندگی پھر بھی لے گی ہماری شرن

اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

حکیم محمد مصطفےٰ خاں مدّاح

(احمق پھپھوندوی)

کڑے مرحلے

نہیں سہل آزادیِ ہند یارو — ابھی تم کو میداں میں آنا پڑے گا
ابھی امتحاں تم کو دینے پڑیں گے — ابھی تم کو جیلوں میں جانا پڑے گا
ابھی چکیاں پیسنی ہوں گی تم کو — ابھی پمپ و گرزہ چلانا پڑے گا
ابھی جسم ہوں گے لہو، پتھروں سے — ابھی زخم سینے پہ کھانا پڑے گا
پڑے گا ابھی کام تیغ و تبر سے — ابھی خاک و خوں میں نہانا پڑے گا
ہوائی جہاز آ کے یورش کریں گے — ابھی سر پہ بم کا نشانہ پڑے گا
یہ سب امتحاں ختم ہو جائیں گے جب — تو سر تم کو اپنا کٹانا پڑے گا
کھچو گے ابھی تختۂ دار پر تم — ابھی تم کو پھانسی پہ جانا پڑے گا

بہت سے کڑے مرحلے راہ میں ہیں
یہ طے کر کے منزل تک آنا پڑے گا

ہمارا دیس

جگ سے بھلا سنسار سے پیارا
دل کی ٹھنڈک، آنکھ کا تارا
سب سے انوکھا سب سے نیارا
دنیا کے جینے کا سہارا
پیارا بھارت دیس ہمارا

کتنی پُرکیف اس کی ادائیں
کتنی دلکش اس کی فضائیں
مشک سے بڑھ کر اس کی ہوائیں
خلد سے بہتر اس کا نظارا
پیارا بھارت دیس ہمارا

ملک کو حاصل ہو آزادی
ختم ہو دورِ ستم ایجادی
دور ہو اس کی سب بربادی
چرخ پہ چمکے بن کے تارا
پیارا بھارت دیس ہمارا

ہم میں پیدا ہو یک جائی
سب ہوں باہم بھائی بھائی
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
گائیں مل کر یہ گیت پیارا
پیارا بھارت دیس ہمارا

روش صدیقی

بیداریِ مشرق

انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب
وقت آیا ہے کہ اٹھے روئے گیتی سے نقاب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق!
انقلاب ....!

اے جمالِ شمعِ آزادی کے پروانو! اٹھو
سو چکے اے قصرِ ملت کے نگہبانو! اٹھو
بادۂ بیداریِ مشرق کے مستانو! اٹھو
اب جگا بھی دو بہت کچھ سو چکا ہے آفتاب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

نوجوانو! اب نشاطِ کنجِ تنہائی کہاں؟
اے شجاعو! تم کہاں، یہ عیش پیمائی کہاں؟
پھونک دو، محفل کو' وقتِ محفل آرائی کہاں؟
دور پھینکو ساغرو پیمانہ و چنگ و رباب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

زندگی' تا بندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ

زندگی ہی زندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ
زندہ رہنا ہے تو آزادی سے کیسا اجتناب؟
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

اب بھی آنکھوں میں تمھاری رنگِ غفلت دیدہ ہے!
خوابِ مستقبل کی ہر تعبیر نا پوشیدہ ہے!
انتظارِ صبح کیسا! صبح خود خوابیدہ ہے
تم ہی خود بڑھ کر الٹ دو مہرِ زریں کا نقاب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

برق ہو آنکھوں میں' دل میں آتشِ پروانہ ہو
ہوش بھی آئے تو لب پر نعرۂ مستانہ ہو
خامشی میں جرأتِ بیداد کا افسانہ ہو
زندگی کب تک اسیرِ اعتکاف و احتساب!
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

زیست کی قیمت ہی کیا ہے پیشِ مردانِ وفا
کوئی پوچھے کربلا سے..........رازِ پیمانِ وفا
ہاں دکھا دو، اے شجاعو! جوشِ ارمانِ وفا
بے حدود و بے کنارو بے شمارو بے حساب!
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب!

دردِ ملّت لے کے اے ملّت کے غمخوارو چلو!
اے جوانو! اے دلیرو اے رضا کارو! چلو!
منتظر ہے رحمتِ یزداں --- وفادار و! چلو!
یوں ہی کھل جاتے ہیں اکثر قصرِ آزادی کے باب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

سرخیِ خونِ وفا سے زندگی گلریز...... ہے
غیرتِ مزدور ...... برقِ خرمنِ پرویز ...... ہے
جس کا تیشہ آج شعلہ بار، و آتش خیز ہے
ہاں وہی ہے کامران و کامگار و کامیاب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

شرم آئے اپنی ناکامی پہ استبداد کو
اب نہ صیادی کی جرأت ہو کسی صیاد کو
تیز کر دو شعلہ ہائے فطرتِ آزاد کو
بجلیوں سے سیکھ لو رازِ سکون و اضطراب!
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

آسمانِ سرفروشی کے ستاروں کی قسم
پاک بازوں کی قسم، شب زندہ داروں کی قسم
تم کو ناموسِ وطن کے جاں نثاروں کی قسم
جاگ اٹھو، دیکھو گے کب تک یوں ہی امیدوں کے خواب
انقلاب! اے ساکنان ارضِ مشرق انقلاب

جاں نثارانِ وطن ہیں وارثِ دارالسلام
ہے بہت اونچا وطن پر مرنے والوں کا مقام
لیکن اس منزل میں اقدامِ تشدد ہے حرام
تیغِ اخلاص و صداقت ہی ہے تیغ کامیاب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

ہوشیار! اے غافلانِ حالِ بربادِ وطن!
ڈھونڈھتی پھرتی ہے تم کو روحِ ناشادِ وطن
گر ہُوا اب بھی نہ تم کو پاسِ فریادِ وطن
آہ کیا دو گے وطن کے ذرّے ذرّے کو جواب؟
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب!

وقار انبالوی

میدانِ جنگ[1] میں صبح

الٹ رہا ہے دیر سے طلسم کالی رات کا
بدل رہا ہے رنگ پھر تمام کائنات کا
پری اڑی وہ نیند کی خمارِ خواب اتر گیا
وہ چہرۂ حیات سے سیہ نقاب اتر گیا
خموشیاں بدل رہی ہیں پھر خوشی کے شور سے
سکوں شکست کھا رہا ہے زندگی کے شور سے
غریبِ دشت جاگ اٹھا رئیسِ شہر جاگ اٹھا
سپاہیوں کے قلب میں خدا کا قہر جاگ اٹھا
ہر ایک سر فروش اٹھا سلاحِ جنگ چوم کر
وفورِ عزم و شوق میں چلا ہے جھوم جھوم کر
سلاحِ جنگ باندھ کر ہوئی ہے لیس فوج پھر
کہ جوئے ننگ و نام میں اٹھی ظفر کی موج پھر
چمک رہی ہیں بجلیاں نگاہِ شعلہ بار میں
بپا ہے ایک زلزلہ فضائے کارزار میں
وطن کے سر فروش ہیں وطن کے جاں نثار ہیں
نہیں ہے اپنا پاس کچھ وطن کے پاس دار ہیں
یہ مرد اپنی موت سے لڑیں گے سینہ تان کر
قضا کو چھیڑتے رہیں گے اپنی جان جان کر
ہے رنگِ نازِ مردمی ہر اک رخِ نیاز پر
چھڑا وہ نغمۂ دغا بہادری کے ساز پر

---

[1] جنگِ آزادی

ترانۂ جنگ

بڑھو بہادرو بڑھو! علَم وطن کا کھول کر
کرو مقابلہ عدو کا تیغ تول تول کر
وطن کی آن تم سے ہے وطن کی شان ہو تمھی
وطن کی لاج تم سے ہے وطن کا مان ہو تمھی
وطن کے حلقہ ہائے غم بہادری سے کاٹ دو
خلیج بزدلی کو اپنی خاکِ پا سے پاٹ دو
فلک کو لاکھ بیر ہو عدو کو لاکھ لاگ ہو
تمھاری سدِ راہ آج خون ہو نہ آگ ہو
لڑو تو اس طرح لڑو بہادری نثار ہو
مقابلہ ہو موت سے تو موت شرمسار ہو
غنیم کو ڈھکیل دو عدو کے سر پہ جا چڑھو
ظفر تمھارے ہاتھ ہے بڑھے چلو بڑھو! بڑھو!
وہ نعرہ ہائے دل شکن نہیب رعد بن گئے
گرج کے مردِ صف شکن رقیب رعد بن گئے
بہادروں کی ہمتوں کو اذنِ جنگ مل گیا
وہ زندگی کے رنگ میں قضا کا رنگ مل گیا
کٹیں گے سر، ٹلیں گی اب بلائیں ملک وقوم کی
کمک کو آرہی ہیں وہ دعائیں ملک و قوم کی

احسان دانش

فقدانِ معاش

ایک دفتر کی طرف کل ہو گیا میرا گزر
کیا کہوں ان رازبیں آنکھوں کو کیا آیا نظر
ایک معمولی اسامی سینکڑوں امیدوار
ایک شمعِ بزم ' پروانے ہزاروں بے قرار
اور اندر اک ضعیف العمر با رعب و جلال
بے رخی سے کر رہا تھا عرضیوں کی دیکھ بھال
گرمیِ تحریر سے کچھ دیر آنکھیں سینک کر
مسکرا دیتا تھا عرضی ٹوکری میں پھینک کر
قہر تھا درخواستوں کی روح پر گرمِ عمل
قینچیاں ہونٹوں کی، نظروں کے پرے، تیور کے بل
اہلِ غیرت کے لیے تھا ڈوب جانے کا مقام
اہلِ دفتر کو غرض مندوں کا جھک جھک کر سلام
بے نیازی کی نگاہوں میں تھا اک نقصِ شعور
خوشخطی کا زعم اور مضموں نگاری کا غرور
صبح کالج رو رہی تھی ڈگریوں کی شام پر
علم تھا خاموش اپنے دل شکن انجام پر
ضبط کے سانچے میں ڈھل کر بن رہی تھی انفعال

مفلسی کی بے زبانی ، منشی کی قیل و قال
بن رہا تھا سینۂ عبرت میں اک گہری خراش
ماہ سیماؤں کی نازک انگلیوں کا ارتعاش
اہلِ بینش کے لیے تھا درسِ عبرت سر بسر
مستند ہندی غلاموں کی یہ ذلت اس قدر
واہ ری قسمت کہ تھا ننگِ شرافت میں شمار
عہدہ داری کا تدبر، خاندانوں کا وقار
کاغذی جامہ پہن کو کھو چکی تھی آبرو
ہوٹل کی گنگناتی خلوتوں کی آرزو
سینکڑوں کاغذ کے پرزوں پر تھی مجبور نیاز
مسٹروں کی شانِ خودداری، مسوں کی روحِ ناز
تھے یہاں سب بے اثر کیا تمکنت کیا التجا
اہلِ دولت کی سفارش، پارساؤں کی دعا
یک بیک آئی مرے پہلو سے آوازِ ضمیر
وقتِ بیداری ہے اے زندانِ حسرت کے اسیر
دے دیا ہے تجھ کو غفلت نے غلامی کا خطاب
ہے تری غیرت کے منہ پر بے حیائی کی نقاب
ہو چکا ہے تیری خودداری کا شیشہ چور چور
کھول آنکھیں اے غلاموں کے غلامِ بے شعور

امیر ملک کے فقیر باشندے

سردی کے نکلتے موسم میں اللہ رے پھبن بازاروں کی
ہر سمت سے جگمگ کرتی ہیں دوکانیں ساہوکاروں کی
ہیں ڈھیر ہزاروں گندم کے شکر کے تکوں کے چینی کے
آثار نمایاں ہر شے سے خالق کی کرم آگینی کے

غلّوں کے چھکڑے ساتھ لیے دیہات سے دہقان آتے ہیں
کچھ ہوش کی باتیں کرتے ہیں کچھ خوف سے سہمے جاتے ہیں
چہروں پر رنگ صداقت کا معصوم جبینیں تاباں ہیں
یہ شرم و حیا کے پتلے ہیں فطرت کے دلارے انساں ہیں
میں اس منڈی کی ہلچل میں جس سمت نظر دوڑاتا ہوں
کثرت سے یہاں انسانوں کو مصروفِ گدائی پاتا ہوں
اور ان میں ضعیف العمر بھی ہیں، کمزور بھی ہیں لاچار بھی ہیں
کچھ صیدِ الم نوخیز بھی ہیں، پامالِ فلک خوددار بھی ہیں
اندوہ سے آنکھوں میں سرخی افلاس کا غم پیشانی پر
دن اہلِ دول کی منت میں، راتوں کو گزارا پانی پر
پلکوں کے تلے کچھ سایہ سا ابرو پہ غبارِ راہ بھی ہے
ہر گام پہ آہِ سرد بھی ہے، ہر سانس پہ اُف اللہ بھی ہے
مٹی کی تہیں رخساروں پر کشکولِ گدائی ہاتھوں میں
اک درد سا نادم لہجوں میں اک ہوک سی غمگیں باتوں میں

دل سوزِ الم سے جلتا ہے، لبریز لہو سے سینا ہے
اس ملک میں رہنے والوں کا یہ مرنا ہے یا جینا ہے

وہ ملک جہاں برساتوں میں امرت کی پھواریں پڑتی ہوں
وہ ملک جہاں کے ذرّوں کی خورشید سے آنکھیں لڑتی ہوں
وہ ملک، ہوں جس پر بنیادیں عالم کے تجلی خانوں کی
وہ ملک، نگاہیں جس پر ہوں شمشیر بکف سلطانوں کی
وہ ملک جہاں زر برسائیں مخمور گھٹائیں گردوں سے
وہ ملک جہاں ضو پھیلائیں زر تار شعاعیں گردوں سے
وہ ملک جہاں گلزاروں میں اٹھلا کے ہوائیں چلتی ہوں
وہ ملک جہاں میدانوں میں جنت کی بہاریں پلتی ہوں
وہ ملک جو مشرق و مغرب کی اقوام کا پالن ہار بھی ہو
افسوس وہاں کے لوگوں پہ افلاس بھی ہو ادبار بھی ہو

امیدِ آزادی

کل تھا گرمِ گفتگو اس طرح اک احرام پوش
بربطِ باطل میں حق کے ساز کی آواز ہے
اللہ، اللہ، یہ عقیدوں کی سراب آرائیاں
کس تکلف سے غلامی زمزمہ پرداز ہے
کیا خبر اس کو کہ جائے گی ثریا تک یہ آگ
سینۂ مزدور میں جس کا ابھی آغاز ہے
گونج اٹھنے کو ہیں ہر گوشے میں آزادی کے راگ
خامشی کا لحہ لحہ گوش برآواز ہے

غلامی کی خصوصیات

حماقت ہے یقیں کرنا غلاموں کی محبت کا
بھروسا کچھ نہیں ان تاجرانِ ملک و ملت کا
ضیا ایمان میں ہے اور نہ ضو پرہیزگاری میں
ہے داغِ خود فروشی دامنِ طاعت گزاری میں
یہ شاخِ آرزو کو پھولنے پھلنے نہیں دیتے
یہ آزادی کی اٹھتی بیل کو چلنے نہیں دیتے
اماں ملتی ہے اکثر سفلگی کو خیر خواہی میں
ہجومِ دشمنانِ قوم ہے دربار شاہی میں
غلامی کے شبستانوں میں زہریلا اجالا ہے
جو اس میں آکے سویا وہ کہاں پھر اٹھنے والا ہے

جمیل مظہری

نالۂ جرس

بڑھے چلو بڑھے چلو — بڑھے چلو بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں! غرورِ کارواں ہو تم — جہانِ پیر کے لیے شبابِ جاوداں ہو تم

بہ نقشِ پائے رفتگاں — بڑھے چلو بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو بڑھے چلو

اٹھائے سر بڑھے چلو تنے ہوئے غرور سے — تمھارے قافلے کی شان دیکھتی ہیں دور سے

ہمالیہ کی چوٹیاں — بڑھے چلو بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو بڑھے چلو

سلامِ موجِ گنگ لو مجاہدانِ حریت — ہیں گلفشاں بہشت سے پیمبرانِ حریت

کھلا ہے عرصۂ جہاں — بڑھے چلو بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو بڑھے چلو

خرابِ بادۂ خودی مئے عمل پیے ہوئے — علم بہ دوش و صف بہ صف کلاہ کج کیے ہوئے

مثالِ بحرِ بیکراں — بڑھے چلو بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو بڑھے چلو

بڑھے ہوئے ہوں حوصلے چڑھی ہوئی ہو آستیں — بدل دو صورتِ جہاں الٹ دو صفحۂ زمیں

پلٹ دو دورِ آسماں — بڑھے چلو بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو بڑھے چلو

قسم تمھارے عزم کی فدا تمھاری شان کے — بڑھا کے ہاتھ توڑ لو ستارے آسمان کے

جھکا دو شاخِ کہکشاں — بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو بڑھے چلو

بنائے کہنہ توڑ دو بناؤ اک جہانِ نو — جہانِ نو جہانِ نو بہ سقفِ آسمانِ نو
نئے مکیں نیا مکاں — بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو بڑھے چلو

نہ ہو سوالِ این وآں نہ ہو تمیزِ بحر و بر — عبث ہے خوف تیرگی ستارے چھپ گئے اگر
چمک رہی ہیں بجلیاں — بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو بڑھے چلو

بجھے نہ شمعِ دل کہیں ہوا ہے تیز باغ کی — اگر اندھیری رات ہے بڑھا دو لو چراغ کی
گرج رہی ہیں آندھیاں — بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو بڑھے چلو

جنابِ خضر پیر ہیں لکیر کے فقیر ہیں — کماں کا ساتھ دیں گے کیا وہ نوجواں جو تیر ہیں
چوں تیرِ جستہ از کماں — بڑھے چلو بڑھے چلو
برادران نوجواں — بڑھے چلو بڑھے چلو

جو عقل راہ روک دے تو اس کا ساتھ چھوڑ دو — جو مذہب آکے ٹوک دے تو اس کی قید توڑ دو
ہوا کی طرح سرگراں — بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو بڑھے چلو

رکے نہ پائے جستجو بچھے ہیں خار راہ میں — جھکے نہ پرچمِ علم کھڑے ہیں دار راہ میں
مثالِ گردِ کارواں — بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو بڑھے چلو

کھلے ہیں پھول زخم کے اجل گلے کا ہار ہے — لہو سے سرخ ہیں کفن یہ مژدۂ بہار ہے
نثارِ تیغِ خوں فشاں — بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو بڑھے چلو

سنو میری صدا سنو درائے کارواں ہوں میں — مخبرِ راتِ فاقہ کش کی دکھ بھری فغاں ہوں میں
قدم بڑھاؤ مہرباں — بڑھے چلو بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں بڑھے چلو بڑھے چلو
غریب بچے قوم کے بلک رہے ہیں بھوک سے خدا کا عرش ہل رہا ہے مامتا کی ہوک سے
گرے نہ سر پہ آسماں بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں بڑھے چلو بڑھے چلو
فسانہ ہائے بیکسی زبانِ درد سے سنو اگر ہو پہلوؤں میں دل ہوائے سرد سے سنو
پیامِ اشکِ بے کساں بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں بڑھے چلو بڑھے چلو
جو راہبر ٹھہر گئے نہیں مقامِ پیش و پس جو ہم سفر بچھڑ گئے تو چھیڑو نالۂ جرس
سنو جمیلؔ کی فغاں بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں بڑھے چلو بڑھے چلو

الطاف مشہدی

لمحاتِ آزادی

گھٹاؤں کے سایوں کی مستی سے بڑھ کر
حسیں بربطوں کے ترنم سے پیارے
وطن کے حسینوں کے ناموں سے میٹھے
محبت کے آوارہ راگوں سے پیارے
ستاروں کے پرنور بستر سے دلکش
بہاروں کی اٹھتی جوانی سے شیریں

فرشتوں کی پاکیزہ ہستی سے بڑھ کر
لب دل نشیں کے تبسم سے پیارے
نگاہوں کے پرکیف جاموں سے میٹھے
سلیما کی زلفوں کے ناگوں سے پیارے
مہ و مہر کے سیمگوں گھر سے دلکش
مری عاشقی کی کہانی سے شیریں

وہ لمحات گزریں جو آزادیوں میں
وہ اوقات گزریں جو آزادیوں میں

ماں کی دعا

تیرے دم سے پھر وطن والوں میں پیدا ہو حیات
پنجۂ اغیار سے ہو ہند کو حاصل نجات
کام آجائے وطن کی راہ میں تیرا شباب
غیرتیں زندانیوں کی پھر الٹ ڈالیں نقاب
تو بدل ڈالے نظامِ ہند کے لیل و نہار
یہ غلام آباد ہو آزاد ملکوں میں شمار
آستینِ ہند ہو تیرے لہو سے لالہ فام
پادشاہوں کا لقب پانے لگیں ہندی غلام

بڈیاں پس کر بنیں غازہ عروسِ ہند کا
حسن پھر ہو جائے کچھ تازہ عروسِ ہند کا
تیرے ہونٹوں سے بوقتِ مرگ یہ نکلے صدا
نوجوانانِ وطن آگے بڑھو آگے ذرا

قومی ترانہ

اے مرے ہندوستاں جنت نشاں
بہہ رہی ہیں تیرے سینے پر وہ شیتل ندیاں
کھیلتا ہے جن کی لہروں پر سروروں کا جہاں
جھومتا ہے جن سروروں میں شبابِ جاوداں
پاسبانی جن کی کرتا ہے ہمالہ سا جواں

اے مرے ہندوستاں جنت نشاں
تیرے باغوں کی لہک سے جھانکتی ہے زندگی
زندگی وہ موت کو بھی جس سے ہو شرمندگی
جس سے حاصل ہو حریمِ روح کو تابندگی
خلد زاروں کا ہے تیرے گلستانوں پر گماں

اے مرے ہندوستاں جنت نشاں
تیرے پربت سیم و زر کا گنگناتا آبشار
تیرے چشمے بربطِ ناہید کا زرّین تار
تیرے جنگل خلد کے سپنے کی سندر سی بہار
مست جھونکوں کی زباں پر مدھ بھری موسیقیاں

اے مرے ہندوستاں جنت نشاں

تیری مستانہ ہواؤں میں جوانی ضو فگن
ذرّے ذرّے سے نمایاں طور کا سا بانکپن
مسکراتی ہے فضاؤں میں نشیلی سی چبھن
تیری وادی میں سرور و کیف کی نہریں رواں

اے مرے ہندوستاں جنت نشاں

بامِ آزادی کے خوش انجام زینے کے لیے
تیری الفت کے نشیلے جام پینے کے لیے
یعنی تیری گود میں آزاد جینے کے لیے
بجلیاں بن کر گریں گے غیر پر ہم ناگہاں

اے مرے ہندوستاں جنت نشاں

فیض احمد فیض

تسلّی

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے، معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا، کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں

ہم کو رہنا ہے، پہ یوں ہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

رضی عظیم آبادی

نوجوانوں کی دُنیا

وہ دنیا جس کا ہرذرّہ جنوں بردوش ہوتا ہے
وہ دنیا جس کے سینے میں بلا کا جوش ہوتا ہے
وہ دنیا جس میں حسن و عشق کی باتیں نہیں ہوتیں
وہ دنیا جس میں سونے کے لیے راتیں نہیں ہوتیں
جہاں تلوار کی جھنکار سے چشمے ابلتے ہیں
جہاں خود موت کی آغوش میں انسان پلتے ہیں
جہاں طوفاں میں قومیت وطن کی ناؤ کھیتی ہے
کمانوں کی کڑک میں حریت انگڑائی لیتی ہے
جہاں ہر دل میں آزادی کی ہوتی ہے لگن پیدا
جہاں ہوتا ہے شوقِ جاں نثاریِ وطن پیدا
جہاں آلام میں ہوتا ہے لوہے کا جگر پیدا
جہاں ہوتا ہے چھد کر ناوکوں سے بال و پر پیدا
جہاں جذباتِ خودداری دبانے سے ابھرتے ہیں
جہاں شیرانِ جنگ آور تھپکنے سے بپھرتے ہیں
جہاں خاشاک طوفانوں میں گھر کر مسکراتا ہے
جہاں خرمن شعاعِ برق سے آنکھیں لڑاتا ہے

جہاں کا چپہ چپہ ، انقلاب آباد ہوتا ہے
دماغ و دل جہاں زنداں میں بھی آزاد ہوتا ہے

جہاں مجبور ،جابر کی لحد تیار کرتا ہے
توانا کو جہاں بے دست وپا بیمار کرتا ہے

جہاں مظلومیت توہینِ استبداد کرتی ہے
جہاں شاہنشہی کو بندگی برباد کرتی ہے

جواں ہمت جہاں تقدیر پر قانع نہیں ہوتی
کوئی مشکل جہاں تدبیر میں مانع نہیں ہوتی

تجھے اے نوجواں ایسا جہاں تیار کرنا ہے
اسی کوشش میں جینا ہے اسی کوشش میں مرنا ہے

معین احسن جذبی

دعوتِ جنگ

وہ ہوئی لرزش ہوا میں وہ بگل بجنے لگا
جنگ کے نغموں سے وہ تھرّائی دنیا کی فضا
دل دھڑکتا ہے فلک پر آج اسرافیل کا
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

ہرطرف، ہر سمت ،کشت وخون کا طوفان ہے
جاں بلب کوئی ہے ،کوئی پیکرِ بے جان ہے
یہ سمجھ لے ساری دنیا جنگ کا میدان ہے
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

دیکھ وہ مزدور اٹھے ہیں برائے انتقام
ہاں الٹنا ہے تجھے سرمایہ داری کا نظام
کیوں نہیں ہوتی تری تلوار آخر بے نیام
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

گرمیاں گفتار میں رکھی ہیں کس دن کے لیے
آندھیاں رفتار میں رکھی ہیں کس دن کے لیے
بجلیاں تلوار میں رکھی ہیں کس دن کے لیے
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

سازِ عالم خون کے نغموں سے ہم آہنگ ہے

مثلِ ارجن معرکے میں ہچکچانا ننگ ہے

جنگ کا تو دیوتا ہے، تیری فطرت جنگ ہے

اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

وہ فلک رتبہ محل ،وہ معصیت کی عیش گاہ

جن میں کنواری لڑکیوں کی عصمتیں کرتی ہیں آہ!

ایسا منظر دیکھ سکتی ہے سپاہی کی نگاہ؟

اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

جھومتا چل اور خونخواروں کے سینے چیر ڈال

اک قدم بڑھ ،اور غداروں کے سینے چیر ڈال

ظلمتِ شب میں سیہ کاروں کے سینے چیر ڈال

اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

دیکھ مے خانے ہیں وہ، جا اور مے خانوں کو توڑ

مے کشوں کے دل میں خنجر بھونک ، پیمانوں کو توڑ

اس طرف مسجد کو ڈھا،اس سمت بت خانوں کو توڑ

اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

آج ان زردار آقاؤں کے دل گردے نکال

ان کو توپوں کے دہانوں سے فضاؤں میں اچھال

دور بھاگیں تجھ سے جو ان کے لیے بھالا سنبھال

اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

جو تجھے روٹی کو ترساتے تھے ان کو دے صدا
دوبدو آجائیں وہ تیرے، تو پھر گونجے ذرا
ڈوب کر ان کے لہو میں تیرا خونی قہقہا
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ
جو نہ تیری ہمنوا ہوں وہ زبانیں کاٹ ڈال
خم شدہ سی شہر یاروں کی کمانیں کاٹ ڈال
بے بسوں کے خون کی پیاسی سنانیں کاٹ ڈال
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ
تجھ کو روکیں گے بہ منت کتنے شیخ و برہمن
نوعِ انسانی کے دشمن، مذہبوں کے گورکن
ہاں انہی کے خون سے ہوں سرخ صحرا و چمن
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ
آئیں گے لے لے کے رشوت رشکِ دارا، فخرِ جم
بافراواں سیم وگوہر، بافریب چشمِ نم
ایسے سانپوں کو کچل ڈالیں مگر تیرے قدم
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ
جن کے آگے ہاتھ کانپیں ان حسینوں کو نہ دیکھ
تو ہے جلادِ فلک، زہرہ جبینوں کو نہ دیکھ
آسماں پر وار کر بڑھ کر زمینوں کو نہ دیکھ
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

انقلابی گیت گاتا چل، پر اس انداز میں
اژدھے آتش کے بل کھائیں تری آواز میں
آگ لگ جائے جفا کاروں کے رنگیں ساز میں
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

وہ بلندی پر ہے مزدوروں کا پرچم آگ سا
اس کی جانب دیکھ جب تھکنے لگیں تیرے قوئ
زور آجائے گا بازو میں ترے سہراب کا
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

تو سرِ دشمن کا گاہک جنگ کے بازار میں
موت کا ہنستا ہوا چہرہ تری تلوار میں
فتح کے مژدے تری تلوار کی جھنکار میں
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

مخدوم محی الدین

جنگ

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
کیوں ٹمٹما رہی ہے یہ پھر شمعِ زندگی
پھر کیوں نگارِ حق پہ ہیں آثار بیوگی
عفریتِ سیم و زر کے کلیجے میں کیوں ہے پھانس
کیوں رک رہی ہے سینے میں تہذیب نو کی سانس
امن و اماں کی نبض چھٹی جارہی ہے کیوں؟
بالینِ زیست آج اجل گا رہی ہے کیوں؟
اب دولہنوں سے چھین لیا جائے گا سہاگ
اب اپنے آنسوؤں سے بجھائیں وہ دل کی آگ
بربط نوازِ بزمِ الوہی ادھر تو آ!
دعوت دہِ پیامِ عبودی ادھر تو آ!

انسانیت کے خون کی ارزانیاں تو دیکھ
اس آسمان والے کی بیدادیاں تو دیکھ
معصومۂ حیات کی بیچارگی تو دیکھ
دستِ ہوس سے حسن کی غارت گری تو دیکھ

خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی
قربان گاہِ موت پہ رقصاں ہے زندگی
انسان رہ سکے کوئی ایسا جہاں بھی ہے
اس فتنہ زا زمیں کا کوئی پاسباں بھی ہے

او آفتابِ رحمتِ دوراں طلوع ہو
او انجمِ حمیتِ یزداں طلوع ہو

مشرق

جنگ، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکان
زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا مسان
وہم زائیدہ خداؤں کا ، روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ
کھیلتی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھ
ایک ننگی نعشِ بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی
ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں
اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں

پیکرِ ماضی کا اک بے رنگ اور بے روح خول
ایک مرگ بے قیامت ایک بے آواز ڈھول
اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خوابِ اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں
اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

موت کا گیت

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خونِ انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مورِ بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا
وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کردیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھردیں
ظلمتِ کفر کو ایمان نہیں کہتے ہیں
سگِ خوں خوار کو انسان نہیں کہتے ہیں
دشمنِ جاں کو نگہبان نہیں کہتے ہیں
جاگ اٹھنے کو ہے اب خوں کا تلاطم دیکھو
ملک الموت کے چہرے کا تبسم دیکھو

جان لو قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں
ناگہاں موت کا گرداب کسے کہتے ہیں
قبر کے پہلوؤں کی داب کسے کہتے ہیں

دورِ ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا
روحِ انساں کو اب آزاد کیا جائے گا

نالۂ بے اثر اللہ کے بندوں کے لیے
صلۂ دار و رسن حق کے رسولوں کے لیے
قصرِ شدّاد کے در بند ہیں بھوکوں کے لیے

پھونک دو قصر کو گرگن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاوو آؤ
بجلیو آؤ گرج دار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ

آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

آزادیِ وطن

کہو ہندوستاں کی جے

کہو ہندوستاں کی جے کہو ہندوستاں کی جے

قسم ہے خون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی
قسم ہے خونِ دہقاں کی قسم خونِ شہیداں کی
یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں
یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں
جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کردیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
زمینِ پاک اب ناپاکیوں کو ڈھو نہیں سکتی
وطن کی شمعِ آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی

کہو ہندوستاں کی جے کہو ہندوستاں کی جے

وہ ہندی نوجواں یعنی علم بردارِ آزادی
وطن کی پاسباں وہ تیغ جوہردارِ آزادی
وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے
وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہے
وہ شمعِ زندگانی آندھیوں نے جس کو پالا ہے
اک ایسی ناؤ طوفانوں نے خود جس کو سنبھالا ہے

وہ ٹھوکر جس سے گیتی لرزہ براندام رہتی ہے

وہ دھارا جس کے سینے پر عمل کی ناؤ بہتی ہے

چھپی خاموش آہیں شورِ محشر بن کے نکلی ہیں

دبی چنگاریاں خورشیدِ خاور بن کے نکلی ہیں

بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی

مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی

کہو ہندوستاں کی جے کہو ہندوستاں کی جے

کہو ہندوستان کی جے

عمر انصاری

ترانۂ آزادی

بھارت کے اے سپوتو آؤ گلے لگائیں　　اپنی تباہیوں کا افسانہ کہہ سنائیں
سب ایک ہو کے نغمے آزادیوں کے گائیں　　پچھلی مصیبتوں کو اب دل سے بھول جائیں

بھارت کی پاک دیوی ملنے کو آرہی ہے
آزادیوں کا جھنڈا ہمراہ لارہی ہے

اک نور ہے جو سر سے پا تک برس رہا ہے　　گویا مسرّتوں کا چشمہ ابل پڑا ہے
اندازِ والہانہ اقدام جاں فزا ہے　　ہر ذرّۂ چمن اب بیدار ہو گیا ہے

مانندِ رنگ و بو ہیں ہم ہند کے چمن میں
کتنی ہی ملتیں ہوں سب ایک ہیں وطن میں

اب وقت آگیا ہے اٹھیں بہار بن کر　　پھولوں کی انجمن کے نقش و نگار بن کر
تارِ ربابِ ہستی موجِ شرار بن کر　　جوشِ عمل کی ضو میں اک تاجدار بن کر

گلزار حریت میں کچھ تازہ گل کھلادیں
پیشانی وطن پر دھبا جو ہے مٹادیں

شمیم کرہانی

قومی گیت

قومی سپاہی کی زبان سے

ہم کام کے نغمے گاتے ہیں ، بے کار ترانا کیا جانیں؟
جو صرف عمل کے بندے ہیں ، وہ بات بنانا کیا جانیں؟
رگ رگ میں لہو کو گرماتے ، جاتے ہیں ''وطن کی جے'' گاتے
ہم عہدِ جوانی کے ماتے ، بوڑھوں کا زمانا کیا جانیں؟
طوفان میں کشتی کھیتے ہیں ، کہسار سے ٹکر لیتے ہیں
ہم جنگ میں سر دے دیتے ہیں ، ہم پاؤں ہٹانا کیا جانیں؟
بگڑوں کو بنانے آئے ہیں ، غربت کو مٹانے آئے ہیں
ہم آگ بجھانے آئے ہیں ، ہم آگ لگانا کیا جانیں؟
دیوار وہ کالے زنداں کی ، تصویر وہ ظلمِ انساں کی
شاہد ہے ہمارے ارماں کی ، ہم جان چرانا کیا جانیں؟
وہ حسن و جوانی کی راتیں ، وہ کیف و ترنم کی باتیں؟
وہ لعل و گہر کی برساتیں ، ہم لوگ منانا کیا جانیں؟
افلاس کے مارے بندوں کے ، کس طرح بلکتے ہیں بچے؟
جو دیکھ رہے ہیں آنکھوں سے ، وہ جشن منانا کیسا جانیں؟
وہ اور ہیں جو کرتے ہیں ستم ، خود شاد ہیں، دنیا محوِ الم
ہم زخم پہ رکھتے ہیں مرہم ، ہم زخم لگانا کیا جانیں؟
بے خوف چلے سنگینوں پر ، اور روک لی گولی سینوں پر
لکھا ہے ہماری جبینوں پر ، ہم سر کو جھکانا کیا جانیں؟
ہم کام کے نغمے گاتے ہیں ، بے کار ترانا کیا جانیں؟

جواں جذبے

یہ ظلمِ شہنشاہی، جس وقت مٹا دیں گے
سوئی ہوئی دنیا کی قسمت کو جگادیں گے

افلاس کے سینے سے شعلے جو لپکتے ہیں
محلوں میں امیروں کے، وہ آگ لگا دیں گے

ہیں آج بغاوت پر تیار جواں جذبے
جلّاد حکومت کی بنیاد ہلا دیں گے

یوں پھول کھلائیں گے ٹپکا کے لہو اپنا
غربت کے بیاباں کو گلزار بنا دیں گے

ہم پرچمِ قومی کو لہرا کے ہمالہ پر
دشمن کی حکومت کے جھنڈے کو جھکادیں گے

جو آڑ میں مذہب کی، ہنگامہ کرے برپا
ہم ایسے فسادی کو گنگا میں بہا دیں گے

سر جائے کہ جائے جاں، اے مادرِ ہند اک دن
ذلّت سے غلامی کی، ہم تجھ کو چھڑا دیں گے

کس طرح سنورتا ہے، سر دینے سے مستقبل
غیروں کو بتا دیں گے، اپنوں کو سکھا دیں گے

اشتراکی جھنڈا

1

وطن کی آن بان ہے
امنگ کی اٹھان ہے
بہادروں کی شان ہے
سپاہیوں کی جان ہے
بغاوتوں کے دوش پر
یہ امن کا نشان ہے

2

یہ کاکلِ غبار ہے
یہ نغمۂ شرار ہے
یہ موجِ کارزار ہے
یہ جنگ کا سنگار ہے
بغاوتوں کے دوش پر
یہ امن کا نشان ہے

3

یہ پردۂ حرم نہیں
یہ دامنِ صنم نہیں
ہلال کا یہ خم نہیں
صلیب کا علم نہیں
بغاوتوں کے دوش پر
یہ امن کا نشان ہے

4

یہ پیکرِ جلال ہے
یہ نقشۂ جدال ہے
یہ خنجرِ قتال ہے
یہ شیر کی ایال ہے
بغاوتوں کے دوش پر
یہ امن کا نشان ہے

5

دلوں کا دکھ لیے ہوئے
لب فغاں سیے ہوئے
بلند سر کیے ہوئے
نشے میں بے پیے ہوئے

بغاوتوں کے دوش پر
یہ امن کا نشان ہے

6

شباب کو پکارتا
دبی امنگ ابھارتا
فضا میں جوش مارتا
بگاڑتا، سنوارتا

بغاوتوں کے دوش پر
یہ امن کا نشان ہے

7

ستم کے گھر اجاڑتا
جمے قدم اکھاڑتا
جگر مغوں کے پھاڑتا
مثالِ شیر دھاڑتا
بغاوتوں کے دوش پر
یہ امن کا نشان ہے

8

رسومیوں کو ریلتا
سماجیوں کو ٹھیلتا
قیامتوں سے کھیلتا
ہزار ظلم جھیلتا
بغاوتوں کے دوش پر
یہ امن کا نشان ہے

جگاوا

جاگ مرے نوعمر سپاہی جاگ بھی میرے لال
جشن بپا ہے موت کے بن میں
حشر عیاں ہے صحنِ چمن میں
آگ لگی ہے باغِ وطن میں
امن کی راہ نکال

جاگ مرے نو عمر سپاہی جاگ بھی میرے لال
ٹوٹ پڑا ہے، ظلم کا لشکر
گرم ہے قتل و غارت گھر گھر
کیسے بچے گی، عصمتِ مادر
کھلتے ہیں سر کے بال

جاگ مرے نوعمر سپاہی ، جاگ بھی میرے لال
ظلم کی آندھی، غم کا اندھیرا
بحر پہ ہے، طوفان کا ڈیرا
موت کا منھ ، ہر موج کا گھیرا

قوم کی ناؤ سنبھال
جاگ مرے نوعمر سپاہی ، جاگ بھی میرے لال
دھوپ میں مزدوروں کے دل ہیں
چین میں کیسے اہلِ دول ہیں
عرش سے اونچے شیش محل ہیں
ہاتھ میں تول کدال
جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال
لڑکے مرے ہیں ، ایسے بھی گل رُو
موج ہوا میں جن کی ہے خوشبو
سونگھ رہی ہوں، نکہتِ گیسو
عطر میں آپ کو ڈھال
جاگ مرے نوعمر سپاہی ، جاگ بھی میرے لال
قوم کا دم بھرنا ہی دوا ہے
فرض ادا کرنا ہی وفا ہے
دیس جیے مرنا ہی بقا ہے
میان سے تیغ نِکال
جاگ مرے نوعمر سپاہی، جاگ بھی میرے لال
ماں تو نہیں اس جنگ کی حامی
قتل ہوں جس میں ہند کے نامی
پر نہیں اٹھتا بارِ غلامی
گرتی ہوں اٹھ کے سنبھال
جاگ مرے نوعمر سپاہی جاگ بھی میرے لال

اسرار الحق مجاز

ایک جلاوطن کی واپسی

پھر خبر گرم ہے وہ جانِ وطن آتا ہے
پھر وہ زندانیِ زندانِ وطن آتا ہے
وہ خرابِ گل و ریحانِ وطن آتا ہے
مصر سے یوسفِ کنعانِ وطن آتا ہے

"کوئی معشوق بصد شوکت و ناز آتا ہے
سرخ بیرق ہے سمندر میں جہاز آتا ہے"

رندِ بے کیف کو تھی بادہ و ساغر کی تلاش
ناظرِ منظرِ فطرت کو تھی منظر کی تلاش
ایک بھونرے کو خزاں میں بھی گلِ تر کی تلاش
خود صنم خانۂ آذر کو تھی آذر کی تلاش

مژدہ اے دوست کہ وہ جانِ بہار آ پہنچا
اپنے دامن میں لیے برق و شرار آ پہنچا

اپنا پرچم کہ عجب شان سے لہراتا ہے
رنگ اغیار کے چہروں سے اڑا جاتا ہے
کوئی شاداں، کوئی حیراں، کوئی شرماتا ہے
کون یہ ساحلِ مشرق پہ نظر آتا ہے

اپنے میخانے کا اک میکشِ بے حال ہے یہ
ہاں وہی مردِ جواں بخت و جواں سال ہے یہ

مردِ سرکش تجھے آدم کی کہانی کی قسم
روحِ انساں کے تقاضائے نہانی کی قسم
جذبۂ عیش کی ہر شورشِ فانی کی قسم
تجھ کو اپنی اسی بدمست جوانی کی قسم

آ کہ اک بار گلے سے تو لگا لیں تجھ کو
اپنے آغوشِ محبت میں اٹھا لیں تجھ کو

نطق تو اب بھی ہے پر شعلہ فشاں ہے کہ نہیں — سوزِ پنہاں سے تری روح تپاں ہے کہ نہیں
تجھ پہ یہ بار غلامی کا گراں ہے کہ نہیں — جسم میں خون جوانی کا رواں ہے کہ نہیں

اور اگر ہے تو پھر آ تیرے پرستار ہیں ہم
جنسِ آزادیِ انساں کے خریدار ہیں ہم

ساقی و رند ترے ہیں، مئے گلفام تری — اٹھ کہ آسودہ ہے پھر حسرتِ ناکام تری
برہمن تیرے ہیں کل ملّتِ اسلام تری — صبحِ کاشی تری، سنگم کی حسیں شام تری

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

دیکھ بدلا نظر آتا ہے گلستاں کا سماں — ساغر و ساز نہ لے، جنگ کے نعرے ہیں یہاں
یہ دعائیں ہیں، وہ مظلوم کی آہوں کا دھواں — مائلِ جنگ نظر آتا ہے ہر مردِ جواں

سر فروشانِ بلاکش کا سہارا بن جا
اٹھ اور افلاکِ بغاوت کا ستارا بن جا

بدیشی مہمان سے

مسافر بھاگ وقتِ بے کسی ہے — ترے سر پر اجل منڈلا رہی ہے
تری جیبوں میں ہیں سونے کے توڑے — یہاں ہر جیب خالی ہو چکی ہے
یہ عالم ہوگیا ہے مفلسی کا — کہ رسمِ میزبانی اٹھ چکی ہے
نہ دے ظالم فریبِ چارہ سازی — یہ بستی تجھ سے اب تنگ آچکی ہے

مناسب ہے کہ اپنا راستہ لے
وہ کشتی دیکھ ساحل سے لگی ہے

گھٹا جو اس سمندر سے اٹھی ہے — دُرِ خوش آب بھی برسا چکی ہے
مگر اب اس کا عالم ہی جدا ہے — یہ بدلی آگ برساتی اٹھی ہے
ستارہ صبح کا بے نور ہے اب — در و دیوار پر دھوپ آچکی ہے

[illegible]ت تعصب اٹھ رہے ہیں
حقیقت جلوہ فرما ہو رہی ہے

نسیم نرم رو اس گلستاں کی
سمومِ دشت پیما بن چکی ہے

بگولے اٹھ رہے ہیں، بڑھ رہے ہیں
فضائے دہر میں ہل چل مچی ہے

زباں پر آئے گی جو آگ بن کر
وہ شے سینوں میں کروٹ لے رہی ہے

مرتب اک نیا دستور ہوگا
بنا اک دورِ نو کی پڑ رہی ہے

ہلی جاتی ہے بنیادِ قدامت
جوانی ہوش میں آئی ہوئی ہے۔

یہاں ہر شاخ شمشیرِ برہنہ
گلوں سے خون کی بو آ رہی ہے

یہاں کے آسمانِ آتشیں پر
بغاوت کی گھٹا منڈلا رہی ہے

یہاں سے ایک طوفاں چل رہا ہے
یہاں سے ایک آندھی اٹھ رہی ہے

انقلاب

چھوڑ دے مطرب بس اب لِلّٰہ پیچھا چھوڑ دے
کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے

تیری تانوں میں ہے ظالم کس قیامت کا اثر
بجلیاں سی گر رہی ہیں خرمنِ ادراک پر

یہ خیال آتا ہے رہ رہ کر دلِ بیتاب میں
بہہ نہ جاؤں پھر ترے نغمات کے سیلاب میں

چھوڑ کر آیا ہوں کس مشکل سے میں جام و سبو
آہ کس دل سے کیا ہے میں نے خونِ آرزو
پھر شبستانِ طرب کی راہ دکھلاتا ہے تو
مجھ کو کرنا چاہتا ہے پھر خرابِ رنگ و بو
میں نے مانا وجد میں دنیا کو لا سکتا ہے تو
میں نے یہ مانا غمِ ہستی مٹا سکتا ہے تو
میں نے مانا تیری موسیقی ہے اتنی پُر اثر
جھوم اٹھتے ہیں فرشتے تک ترے نغمات پر
ہاں یہ سچ ہے زمزمے تیرے مچاتے ہیں وہ دھوم
جھوم جاتے ہیں مناظر، رقص کرتے ہیں نجوم
تیرے ہی نغمے سے وابستہ نشاطِ زندگی
تیرے ہی نغمے سے کیفِ انبساطِ زندگی
تیری صوتِ سرمدی باغِ تصوف کی بہار
تیرے ہی نغموں سے بےخود عابدِ شب زندہ دار
بلبلیں نغمہ سرا ہیں تیری ہی تقلید میں
تیرے ہی نغموں سے دھومیں محفلِ ناہید میں
مجھ کو تیرے سحرِ موسیقی سے کب انکار ہے
مجھ کو تیرے لحن داؤدی سے کب انکار ہے

بزمِ ہستی کا مگر کیا رنگ ہے یہ بھی تو دیکھ

ہر زباں پر اب صلائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ

فرشِ گیتی سے سکوں اب مائلِ پرواز ہے

ابر کے پردوں میں سازِ جنگ کی آواز ہے

پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب

اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب

آرہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے

آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے

کوہ و صحرا میں زمیں سے خون ابلے گا ابھی

رنگ کے بدلے گلوں سے خون ٹپکے گا ابھی

بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور دَرّاتے ہوئے

اک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے

سرکشی کی تند آندھی دم بدم چڑھتی ہوئی

ہر طرف یلغار کرتی ہر طرف بڑھتی ہوئی

بھوک کے مارے ہوئے انساں کی فریادوں کے ساتھ

فاقہ مستوں کے جلو میں خانہ بربادوں کے ساتھ

ختم ہوجانے کو ہے سرمایہ داری کا نظام

رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوشِ انتقام

گر پڑیں گے خوف سے ایوانِ عشرت کے ستوں
خون بن جائے گی شیشوں میں شرابِ لالہ گوں
خون کی بو لے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی
خوں ہی خوں ہوگا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی
جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں
پُرسکوں صحرا میں خوں، بیتاب دریاؤں میں خوں
دَیر میں خوں، مسجدوں میں خوں، کلیساؤں میں خوں
خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں
ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں
خون کی رنگینیوں میں ڈوب جائے گی بہار
ریگِ صحرا پر نظر آئیں گے لاکھوں لالہ زار
خون سے رنگیں فضائے بوستاں ہو جائے گی
نرگسِ مخمور چشمِ خوں فشاں ہو جائے گی
کوہساروں کی طرف سے "سرخ آندھی" آئے گی
جا بجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی
توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں سے اسیر
بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں میں فقیر

حشر در آغوش ہو جائے گی دنیا کی فضا

دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا

سرخ ہوں گے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام

غرق ہوں گے آتشیں ملبوس میں منظر تمام

اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق

آسماں پر خاک ہوگی، فرش پر رنگِ شفق

اور اس رنگِ شفق میں باہزاراں آب و تاب

جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

جاں نثار اختر

پکار

چمکی ہے افق پہ سرخ مشعل
میدان ہے پھر لہو سے جل تھل
ٹکرا کے گرج اٹھے ہیں بادل
شاعر! ہمیں راستا دکھا دے

طیارۂ جنگ کی تگ و تاز
تاریک فضا میں جیسے شہباز
ہے موت کے شہپروں کی آواز
شاعر! ہمیں راستا دکھا دے

کمزور ہیں سلطنت کے بازو
انصاف کا کیا چلے گا جادو
بجلی سی کڑک رہی ہے ہر سو
شاعر! ہمیں راستا دکھا دے

قوت کا ڈھکوسلا ہے شاہی
افراد کے ذہن کی تباہی
شمشیر سے کاٹ یہ سیاہی
شاعر! ہمیں راستا دکھا دے

ٹوٹی ہیں حکومتوں کی ڈھالیں
اندھی ہیں سیاستوں کی چالیں
مزدور کی تیز ہیں کدالیں

شاعر! ہمیں راستا دکھا دے

جاگا ہے کئی صدی کا افلاس
نظروں میں ہے انتقام کی پیاس
سینے میں دہک اٹھا ہے احساس

شاعر! ہمیں راستا دکھا دے

رنگین تصوّرات کب تک
تعمیرِ عجائبات کب تک
موہوم توقعات کب تک

شاعر! ہمیں راستا دکھا دے

یہ وقت نہیں ہے عاشقی کا
یہ دور نہیں ہے مے کشی کا
اٹھا ہے سوال زندگی کا

شاعر! ہمیں راستا دکھا دے

تقدیر پہ اعتماد تا چند؟
ماضی کی حسین یاد تا چند؟
یہ ہیبتِ برق و باد تا چند؟

شاعر! ہمیں راستا دکھا دے

برسی ہے فلک سے خشمگیں آگ
ابلے ہیں زمیں پہ خون کے جھاگ
اٹھ چھیڑ دے انقلاب کا راگ

شاعر! ہمیں راستا دکھا دے

ہے آگ لگی ہوئی چمن میں
پارا سا بھرا ہے تن بدن میں
شاعر نہیں کیا کوئی وطن میں؟

شاعر! ہمیں راستا دکھا دے

میں ان کے گیت گاتا ہوں

میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں
جو شانے پر بغاوت کا علم لے کر نکلتے ہیں
کسی ظالم حکومت کے دھڑکتے دل پہ چلتے ہیں
میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں
جو رکھ دیتے ہیں سینہ گرم توپوں کے دہانوں پر
نظر سے جن کی بجلی کوندتی ہے آسمانوں پر
میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں
جو آزادی کی دیوی کو لہو کی بھینٹ دیتے ہیں
صداقت کے لیے جو ہاتھ میں تلوار لیتے ہیں
میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں
جو پردے چاک کرتے ہیں حکومت کی سیاست کے
جو دشمن ہیں قدامت کے جو حامی ہیں بغاوت کے
میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں
بھرے مجمع میں کرتے ہیں جو شورش خیز تقریریں
وہ جن کا ہاتھ اٹھتا ہے تو اٹھ جاتی ہیں شمشیریں
میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں
وہ مفلس جن کی آنکھوں میں ہے پرتَوِ قہرِ یزداں کا
نظر سے جن کی چہرہ زرد پڑ جاتا ہے سلطاں کا
میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں

وہ دہقاں جن کے خرمن میں ہیں پنہاں بجلیاں اپنی
لہو سے ظالموں کے سینچتے ہیں کھیتیاں اپنی
میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں

وہ محنت کش جو اپنے بازوؤں پر ناز کرتے ہیں
وہ جن کی قوتوں سے "دیوِ استبداد" ڈرتے ہیں
میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں

کچل سکتے ہیں جو مزدور زر کے آستانوں کو
جو جل کر آگ دے دیتے ہیں جنگی کارخانوں کو
میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں

جھلس سکتے ہیں جو شعلوں سے کفر و دیں کی بستی کو
جو لعنت جانتے ہیں ملک میں فرقہ پرستی کو
میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں

وطن کے نوجوانوں میں نئے جذبے جگاؤں گا
میں ان کے گیت گاؤں گا میں ان کے گیت گاؤں گا
میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں

ساقی

یہ کس نے کھٹکھٹایا آج مے خانے کا دروازہ
ہر اک میکش یکا یک بے پیے برہم اٹھا ساقی

یہ کیسا مے کے بدلے خون چھلکا تیرے شیشے سے
یہ کیسا ساز سے اک نغمۂ ماتم اٹھا ساقی

بغاوت کی ہوائیں چل اٹھیں شاید گلستاں میں
یہ پیمانے الٹ ساقی، یہ جامِ جم اٹھا ساقی

جو ممکن ہو تو تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی

علی جواد زیدی

من کی بھول

تم جب سے پردیس سدھارے
دن میں نے رو رو کے گزارے
راتیں کاٹیں گن گن تارے
تھا اک وہ بھی زمانہ پیارے

دکھ ساگر میں دل کو ڈبویا
چین لٹایا اور سکھ کھویا
آنسو سے چہرے کو دھویا
تھا اک وہ بھی زمانہ پیارے

گھر کے اندر رہنے نہ پائی
دنیا باہر کھینچ کے لائی
دھن دولت کی آس دلائی
تھا اک وہ بھی زمانہ پیارے

بچے رو رو جان گنواتے
پاس نہ تھی جو بھی کیا کھاتے
پیسہ بھی تو نہ تھا جو منگاتے
تھا اک وہ بھی زمانہ پیارے

شہر میں کی دن بھر مزدوری
کرتی ہی کیا، تھی مجبوری
بھوک کی ضد کرنا تھی پوری

تھا اک وہ بھی زمانہ پیارے

تم تھے کہ بالکل بھول گئے تھے
گھر والے آفت میں پھنسے تھے
ظلم ہزاروں جھیل رہے تھے

تھا اک وہ بھی زمانہ پیارے

بل کھاتی تھی جوانی میری
اٹھلاتی تھی جوانی میری
للچاتی تھی جوانی میری

تھا اک وہ بھی زمانہ پیارے

ملک میں اک طوفان بپا تھا
بے کاروں کا شور مچا تھا
جیل میں ہندستان بھرا تھا

تھا اک وہ بھی زمانہ پیارے

روتے تھے ماں باپ اور بھائی
پر ہمت کی شہ جو پائی
جیل کی بستی میں نے بسائی

تھا اک وہ بھی زمانہ پیارے

جیل میں گھر تک یاد نہیں تھا
پھر بھی دل کچھ شاد نہیں تھا
ہندستان آزاد نہیں تھا

تھا اک وہ بھی زمانہ پیارے

ان باتوں کو بہت دن بیتے
کب تک گھٹ گھٹ آنسو پیتے
آخر ہندستانی جیتے

بیتا دکھ کا زمانہ پیارے

اب ہم سب کو آزادی ہے
اب تو گھر گھر آبادی ہے
آبادی ہے اور شادی ہے
بیتا دکھ کا زمانہ پیارے

اب دھن - دولت عام ہوا ہے
ختم ہے غم، آرام ہوا ہے
آس سے بڑھ کر کام ہوا ہے
بیتا دکھ کا زمانہ پیارے

ایسے میں تم بھی آجاؤ
دل کی بستی آکے بساؤ
من کے باسی پھول کھلاؤ
بیتا دکھ کا زمانہ پیارے

لیکن میں یہ کیا کہتی ہوں
کس جھوٹی دھن میں رہتی ہوں
سوکھے دریا میں بہتی ہوں
دہراتی ہوں فسانہ پیارے

میں بھولی اے دیس دلارے
دنیا کی آنکھوں کے تارے
تم تو گئے خود جنگ میں مارے
گاتے گاتے ترانہ پیارے

علی سردار جعفری

آزادی

پوچھتا ہے تو کہ کب اور کس طرح آتی ہوں میں
گود میں ناکامیوں کی پرورش پاتی ہوں میں
صرف وہ مخصوص سینے ہیں مری آرام گاہ
آرزو کی طرح رہ جاتی ہے جن میں کے گھٹ کے آہ
اہلِ غم کے ساتھ ان کا درد و غم سہتی ہوں میں
کانپتے ہونٹوں پہ بن کر بد دعا رہتی ہوں میں
رقص کرتی ہیں اشاروں پر مرے موت و حیات
دیکھتی رہتی ہوں میں ہر وقت نبضِ کائنات
خود فریبی بڑھ کے جب بنتی ہے احساسِ شعور
جب جواں ہوتا ہے اہلِ زر کے تیور میں غرور
مفلسی سے کرتے ہیں جب آدمیت کو جدا
جب لہو پیتے ہیں تہذیب و تمدن کے خدا
بھوت بن کر ناچتا ہے سر پہ جب قومی وقار
لے کے مذہب کی سپر آتا ہے جب سرمایہ دار
راستے جب بند ہوتے ہیں دعاؤں کے لیے
آدمی لڑتا ہے جب جھوٹے خداؤں کے لیے
زندگی انساں پہ کر دیتا ہے جب انساں حرام
جب اسے قانونِ فطرت کا عطا ہوتا ہے نام
دیوِ استبداد کا جب حد سے بڑھتا ہے جنوں

جب پسینہ بن کے پیشانی سے بہہ جاتا ہے خوں
اہرمن پھرتا ہے جب اپنا دہن کھولے ہوئے
آسماں سے موت جب آتی ہے پر تولے ہوئے
جب کسانوں کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے ہراس
پھوٹنے لگتی ہے جب مزدور کے زخموں سے باس
ساغرِ لاؤبی کا جب لبریز ہوتا ہے سبو
سوزِ غم سے کھولتا ہے جب غلاموں کا لہو
غاصبوں سے بڑھ کے جب کرتا ہے حق اپنا سوال
جب نظر آتا ہے مظلوموں کے چہروں پر جلال

تفرقہ پڑتا ہے جب دنیا میں نسل و رنگ کا
لے کے میں آتی ہوں پرچم انقلاب و جنگ کا

ہاں مگر جب ٹوٹ جاتی ہے حوادث کی کمند
جب کچل دیتا ہے ہر شے کو بغاوت کا سمند
جب نگل لیتا ہے طوفاں بڑھ کے کشتی نوح کی
گھٹ کے جب انساں میں رہ جاتی ہے عظمت روح کی
دور ہو جاتی ہے جب مزدور کے دل کی جلن
جب تبسم بن کے ہونٹوں پر سمٹتی ہے تھکن
جب ابھرتا ہے افق سے زندگی کا آفتاب
جب نکھرتا ہے لہو کی آگ میں تپ کر شباب
"نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ"
روند چکتی ہے جب ان سب کو جوانی کی امنگ

رفعتِ عرشِ بریں سے پرفشاں ہوتی ہوں میں
صبح کے زرّیں تبسم میں عیاں ہوتی ہوں میں

آگے بڑھیں گے

وہ بجلی سی چمکی وہ ٹوٹا ستارا
وہ شعلہ سا لپکا وہ تڑپا شرارا
جنونِ بغاوت نے دل کو ابھارا
بڑھیں گے ابھی اور آگے بڑھیں گے

گرجتی ہیں توپیں، گرجنے دو ان کو
دہل بج رہے ہیں تو بجنے دو ان کو
جو ہتھیار سجتے ہیں، سجنے دو ان کو
بڑھیں گے ابھی اور آگے بڑھیں گے

کدالوں کے پھل دوستو تیز کرلو
محبت کے ساغر کو لبریز کرلو
ذرا اور ہمت کو مہمیز کرلو
بڑھیں گے ابھی اور آگے بڑھیں گے

وزارت کی منزل ہماری نہیں ہے
یہ آندھی ہے بادِ بہاری نہیں ہے
زرہ ہم نے تن سے اتاری نہیں ہے
بڑھیں گے ابھی اور آگے بڑھیں گے

حکومت کے پندار کو توڑنا ہے
اسیر و گرفتار کو چھوڑنا ہے
زمانے کی رفتار کو موڑنا ہے
بڑھیں گے ابھی اور آگے بڑھیں گے

چٹانوں میں راہیں بنانا پڑیں گی
ابھی کتنی کڑیاں اٹھانا پڑیں گی

ہزاروں کمانیں جھکانا پڑیں گی
بڑھیں گے ابھی اور آگے بڑھیں گے
حدیں ہو چکیں ختم بیم و رجا کی
مسافت ہے اب عزمِ صبر آزما کی
زمانے کے ماتھے پہ ہے تابناکی
بڑھیں گے ابھی اور آگے بڑھیں گے
افق کے کنارے ہوئے ہیں گلابی
سحر کی نگاہوں میں ہے برق تابی
قدم چومنے آئی ہے کامیابی
بڑھیں گے ابھی اور آگے بڑھیں گے
مصائب کی دنیا کو پامال کر کے
جوانی کی شکلوں میں تپ کے نکھر کے
ذرا نظمِ ہیتی سے اونچے ابھر کے
بڑھیں گے ابھی اور آگے بڑھیں گے
مہکتے ہوئے مرغزاروں سے آگے
لچکتے ہوئے آبشاروں سے آگے
بہشتِ بریں کی بہاروں سے آگے
بڑھیں گے ابھی اور آگے بڑھیں گے

رضا نقوی

مانجھی

بادل بھی گرجتے ہیں مانجھی بجلی بھی چمکتی ہے مانجھی
دائیں بائیں سناٹا ہے اور رات اندھیری ہے مانجھی
بجھتا ہے من کا دیا مانجھی
ہاں کشتی تیز چلا مانجھی

منظر پہ اداسی چھائی ہے، آکاش کا چہرہ اترا ہے
ندی کی لہریں کہتی ہیں، طوفان پھر آنے والا ہے
تیور بدلے ہے فضا مانجھی
ہاں کشتی تیز چلا مانجھی

چل وقت کی لہروں سے آگے پہنچادے "زمانے" سے پہلے
اس پار پہنچنا ہے ہم کو طوفان کے آنے سے پہلے
ہے تیز بہت دھارا مانجھی
ہاں کشتی تیز چلا مانجھی

بیکل ہے ہواؤں میں کشتی سرکش جھونکوں کو کیا کہیے
باہر طوفاں اندر طوفاں من کی لہروں کو کیا کہیے
ہر لہر ہے اک دریا مانجھی
ہاں کشتی تیز چلا مانجھی

اس پار ہمیں لے چل مانجھی فطرت کو جہاں آزادی ہے
کہتے ہیں جسے روحوں کا وطن روحوں کی جہاں آبادی ہے
رہتی ہے جہاں رادھا مانجھی
ہاں کشتی تیز چلا مانجھی

سیّد احتشام حسین رضوی

یہ نظامِ کہنہ

ہم نشیں کھٹکی تو ہوگی تجھ کو بھی یہ ایک بات
کب سے گھیرے ہے نظامِ کہنہ کی تاریک رات
اس شبِ تاریک کی آغوش میں ہے وہ جہاں
جس جگہ اڑتی ہیں عدل و حریت کی دھجیاں
روپے سے رات دن چلتا ہے جس کا کاروبار
سیم و زر سے جس جگہ ہوتے ہیں رشتے استوار
دام لگتے ہیں زبانی جس جگہ اعمال کے
جس جگہ چلتے ہیں سکے تک ضعیف اقوال کے
جس جگہ مفلس کھڑے ہیں کارواں در کارواں
حکم راں ہیں جس جگہ زردار کی عیاریاں
جس جگہ انسانیت کا حال ہے زارو زبوں
چوستا ہے جس جگہ انسان خود انساں کا خوں
جس جگہ قانون کے ڈر سے زباں ہلتی نہیں
جس جگہ بیمار مفلس کو دوا ملتی نہیں
جس جگہ بے کار امیروں کی چمکتی ہے جبیں
جس جگہ محنت کا پھل مزدور کو ملتا نہیں
جس جگہ آگے نکلتا ہے ذلیل کم رہی
جس جگہ تاریخ دہراتی ہے افسانہ وہی
فطرتِ انسان جس جا روشنی پاتی نہیں
جس جگہ علم و ادب میں تازگی آتی نہیں

نوجوانوں کو جہاں ملتی نہیں بڑھنے کی راہ
جس جگہ ترکِ مراسم کو سمجھتے ہیں گناہ
جس جگہ ہر لمحہ پابندی ہے اہلِ ہوش پر
میتِ تہذیب ہے خود غرضیوں کے دوش پر
ہے جہانگیری جہاں جمہوریت کے بھیس میں
جنگ اپنے واسطے ہے دوسروں کے دیس میں
آ گیا وہ وقت خود ہو اپنی ہستی سے خجل
یہ نظامِ کہنہ ، بنیادیں ہیں جس کی مضمحل
اس کی بنیادوں پہ تیشہ مارنے کی دیر ہے
نوجواں تیار ہیں للکارنے کی دیر ہے
ملک پر غیروں کا ڈیرا ختم ہوتا ہی نہیں
کیا قیامت ہے اندھیرا ختم ہوتا ہی نہیں
طاقتِ پرواز ہے اور آشیاں پر قید ہے
حوصلے بیدار ہیں لیکن زباں پر قید ہے
وقت کی آواز ہے ہم کو ابھرنا چاہیے
اس تضادِ زندگی کو ختم کرنا چاہیے
جس نے روکا ہے ترقی سے یہی زنجیر ہے
اس نظامِ کہنہ کی تخریب بھی تعمیر ہے

سلام مچھلی شہری

مجبوریاں

مجھے نفرت نہیں ہے عشقیہ اشعار سے لیکن
ابھی ان کو غلام آباد میں میں گا نہیں سکتا
مجھے نفرت نہیں ہے حسنِ جنت زار سے لیکن
ابھی دوزخ میں اس جنت سے دل بہلا نہیں سکتا
مجھے نفرت نہیں پازیب کی جھنکار سے لیکن
ابھی تابِ نشاطِ رقص محفل لا نہیں سکتا
ابھی ہندوستاں کو آتشیں نغمے سنانے دو
ابھی چنگاریوں سے اک گلِ رنگیں بنانے دو

جنگِ یورپ

1939

جوش ملیح آبادی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو؟
''دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو''
''جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے، بھیڑیا''
''بھیڑیئے کو مار دو گولی پئے امن و بقا''
''باغ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں
آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں''
''ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خود سری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر''

....

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمھاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟

ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی؟
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟
اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی تمھارے ہاتھ کی لائی ہوئی
اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج؟
کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟
ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہِ ظفر کے سامنے؟
یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں؟
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا؟
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا
سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ
ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی؟

یاد تو ہوگا تمھیں جلیان والا باغ بھی؟
پوچھ لو اس سے تمھارا نام کیوں تابندہ ہے
''ڈائرِ'' گرگِ دہن آلود اب بھی زندہ ہے
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے؟
اہلِ آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے
پوچھ لو یہ قیدخانوں کے درو دیوار سے
اب بھی ہے محفوظ جن میں طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جس میں کوڑوں کی صدا
آج کشتی امن کی امواج پر کھیتے ہو کیوں؟
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درسِ حق دیتے ہو کیوں؟
اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
''بینکی'' اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں
لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم
اہلِ حق روشن نظر ہیں اہل باطل کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کمزور ہیں
آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لیے کہتے نہیں؟
کیا کہا ''انصاف ہے انساں کا فرضِ اولیں''
کیا فساد وظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں؟
دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں
گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپِ تازی کیا شفا خانے میں ہے؟

آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟
سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلّانے لگے؟
مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین

....

خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکادو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

اگست39ء

علی سردار جعفری

فوجی بھرتی

سڑک کے اس کنارے اک سیہ لکڑی کے تختے پر
جلی حرفوں میں لکھ رکھا ہے یہ بھرتی کا دفتر ہے
پکارا جا رہا ہے ہند کے بھوکے کسانوں کو
بجھا سا آج اخلاقِ شہنشاہی کا تیور ہے
صدا وہ دے رہا ہے آج انصاف و صداقت کی
جو دنیا سے زیادہ خودستم ران وستم گر ہے
ہمیں کہنا ہے اتنا سامراجی حیلہ بازوں سے
یہ جمہوری ترانہ ایک سحرِ خواب آور ہے
تمھارے جنگلوں میں ہیں ہماری بوٹیاں اب تک
تمھارا راج ہمارا خون پی جانے کا خوگر ہے
نظر آتی ہیں خود اپنے لہو کی سرخیاں ہم کو
نگاہوں میں ہماری قصرِ ابیض قصرِ احمر ہے
ہمارے خون سے شہزادیوں کا روپ نکھرا ہے
ہماری ہڈیوں کے ہار سے ملکہ کا زیور ہے
حکومت ہو تمھاری اور ہم توپوں کا ایندھن ہوں
یہ دیوانے کا اک خوابِ جنوں اے بندہ پرور ہے
بچانا تم کو، خود اپنی غلامی کی حفاظت ہے
غلامی کی حفاظت جرمِ محکومی سے بدتر ہے
اگر چاہو تو تم منہ کھول دو اپنے خزانوں کے
مگر ہندوستاں کا ہر جواں خوددار و خودسر ہے
تمھاری جیب سے چاندی کا جو ٹکڑا نکلتا ہے
ہمارے واسطے وہ ایک قربانی کا پتھر ہے
چلو یوں ہی سہی یہ فوج و پرچم سب تمھارے ہیں
بتا دے گا زمانہ کس کا قابو کس کے اوپر ہے
ہمارا ہر سپاہی ہند کی قسمت کا تارا ہے
یہ مستقبل کا خالق صبحِ صادق کا پیمبر ہے
ابھی تو داستاں تازہ ہے گڑھوالی جوانوں کی
مصیبت جن کا تکیہ خاکِ زنداں جن کا بستر ہے

نہ سر ہوں گی یہ بندوقیں وطن کے پاسبانوں پر — یہ جرأت آزما انکار کتنا روح پرور ہے
غلامی کے لہو میں ذوقِ آزادی کی سرخی ہے — یہ محکومی کا پتلا آج حریت کا پیکر ہے
ہمارے خوں بھرے ماتھے پہ کیا لکھا ہے دیکھو تو — وفورِ شوقِ آزادی سے اب جینا بھی دوبھر ہے
گرانی گولیوں میں ہے، نہ سنگینوں میں تیزی ہے — نہ ہتھکڑیوں میں کس ہے نہ زنجیروں میں لنگر ہے
ستارے کی طرح اب ٹوٹ کر گرنے ہی والا ہے — وہ ہیرا جس کی ضو سے تاجِ انگلستاں منور ہے
نہ بندوقوں کی حاجت ہے نہ توپوں کی ضرورت ہے — جب ایوانِ بکنگھم اپنی نظروں ہی کی زد پر ہے
نگاہیں آج ترچھی ہو چکی ہیں نوجوانوں کی — سمجھ لو اب یہ بجلی ابر کے پردے سے باہر ہے
ہے رخ بدلا ہوا لندن کی جانب سے ہواؤں کا — پرانے جاں نثاروں کی نظر بھی نوکِ خنجر ہے

وفاداری کا دریا بن گیا دھارا بغاوت کا
بس اب موجیں ہی موجیں ہیں نہ کشتی ہے نہ لنگر ہے

جنگ اور انقلاب

رقص کر اے روحِ آزادی کہ رقصاں ہے حیات
گھومتی ہے وقت کے محور پہ ساری کائنات
زندگی میناؤ ساغر سے ابل جانے کو ہے
کامرانی کے نئے سانچے میں ڈھل جانے کو ہے

اڑ رہا ہے ظلم و استبداد کے چہرے سے رنگ
چھٹ رہا ہے وقت کی تلوار کے ماتھے سے زنگ
ہے فضاؤں میں نویدِ شادمانی کا سرور
پڑ رہا ہے عشرتِ فردا کی پیشانی پہ نور

موت ہنس کر دیکھتی ہے آئینہ تلوار میں
زر پرستی کا سفینہ آگیا منجدھار میں
باہمی نفرت کے شعلے، جنگ کی پرہول آگ
پیرزن سرمایہ داری کی ہے بیوہ کا سہاگ

خون کی بو سے مشامِ زندگی مخمور ہے
گولیوں کی سنسناہٹ سے فضا معمور ہے
ہے یہ وہ زنجیر خود ہاتھوں سے ڈھالا تھا جسے
ہے یہ وہ بجلی کہ خود خرمن نے پالا تھا جسے

تیر جو چٹکی میں تھا پیوست اب بازو میں ہے
آستیں میں تھا جو خنجر آج وہ پہلو میں ہے
آگیا ہے وقت وہ جو آکے ٹلتا ہی نہیں
اپنا لنگر آج اپنے سے سنبھلتا ہی نہیں

ہل چکا ہے تختِ شاہی ، گر چلا ہے سر سے تاج
ہر قدم پر ڈگمگایا جارہا ہے سامراج

آگیا ہے وقت وہ جو آ کے ٹلتا ہی نہیں
اپنا لنگر آج اپنے سے سنبھلتا ہی نہیں

ہل چکا ہے تختِ شاہی ، گر چلا ہے سر سے تاج
ہر قدم پر ڈگمگایا جارہا ہے سامراج

ڈھل رہی ہے زرگری کی رات کے تاروں کے چھاؤں
مفلسی پھیلا رہی ہے وقت کی چادر میں پاؤں

انقلابِ دہر کا چڑھتا ہوا پارا ہے جنگ
وقت کی رفتار کا مڑتا ہوا دھارا ہے جنگ

ہم سے آزادوں کا اس دم گیت گانا خوب ہے
سر پھرے باغی جوانوں کا ترانہ خوب ہے

غم کے سینے میں خوشی کی آگ بھرنے دو ہمیں
خوں بھرے پرچم کے نیچے رقص کرنے دو ہمیں

اکبر الہ آبادی

1846—1921

برٹش راج

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشین برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے

جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو
کہ تیل پیچ میں ہے، ڈھیلی اس کی چول بھی ہے

نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمق سے
تمھاری عرض میں گو کچھ زیادہ طول بھی ہے

جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبل کی
جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے

طرح طرح کے بنا لو لباسِ رنگا رنگ
علاوہ روئی کے ریشم بھی اور وول بھی ہے

چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی
کہ آنکھ محو ہے خاطر اگر ملول بھی ہے

اندھیری رات میں جنگل میں ہے رواں انجن
کہ جس کو دیکھ کے حیران چشمِ غول بھی ہے

شگفتہ پارک ہیں ہر طرف رہروؤں کے لیے
نظر نواز ہے پتی حسین پھول بھی ہے

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر
تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے

کبھی ایسی نہ تو تھی

نگرانیِ مراحل کبھی ایسی تو نہ تھی   تند موجِ لبِ ساحل کبھی ایسی تو نہ تھی
بدگمانی تری قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی   بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

کرتی ہے خلق کو لیلائے لبرٹی مفتوں   ہند کے دل کو لبھا لیتا ہے مل کا یہ فسوں
لاجپت بھی ہوئے شاید کہ اسیرِ محزوں   پائے کوباں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں
آتی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

پیشتر اس سے، طبائع کے نہ تھے یہ پہلو   کہیں اشنان کی تھی لہر کہیں موجِ وضو
اے مسِ سیمتن و ماہ جبین و گل رو   تری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

جلوۂ دربارِ دہلی

سر میں شوق کا سودا دیکھا   دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا   کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

خیموں کا اک جنگل دیکھا   اس جنگل میں منگل دیکھا
برھما اور ورنگل دیکھا   عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

کچھ چہروں پہ مردی دیکھی   کچھ چہروں پہ زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی   دل نے جو حالت کردی دیکھی

اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا   بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا   دل دربار سے اٹکا دیکھا

سرخی سڑک پہ کٹتی دیکھی   سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتش بازی چھٹتی دیکھی   مفت کی دولت لٹتی دیکھی

ایک کا حصہ من و سلوا   ایک کا حصہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا   میرا حصہ دور کا جلوا

اوج برٹش راج کا دیکھا   پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگِ زمانہ آج کا دیکھا   رخ کرزن مہراج کا دیکھا

پہنچے پھاند کے سات سمندر   تحت میں ان کے بیسیوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر   اپنی جگہ پر ایک سکندر

اوج بخت ملاقی ان کا   چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا   آنکھیں میری باقی ان کا

انقلابِ دہر دیکھو بن گیا آقا غلام   قصر کا مالک جو تھا اب اس کا درباں ہو گیا

....

عزت ملی ہے شرکتِ کونسل کی شیخ کو   غازہ ملا گیا ہے رخِ فاقہ مست پر

....

عزیزانِ وطن سوچیں سول سروس سے کیا حاصل   یگانوں میں رہو بیگانہ ہو کر اس سے کیا حاصل

....

فلک کے دور میں ہارے ہیں بازیِ اقبال   اگرچہ شاہ تھے بدتر ہیں اب غلام سے ہم

....

نیشنل وقعت کے گم ہونے کا ہے اکبر کو غم   آفیشل عزت کا اس کو کچھ مزا ملتا نہیں

....

ہنگامۂ محشر کا تو مقصود ہے معلوم   دہلی میں یہ دربار ہے معلوم نہیں کیوں
افلاس میں مستی تو مجھے خوش نہیں آتی   ساقی کو یہ اصرار ہے معلوم نہیں کیوں

....

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں   مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں
ناز کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانے نے تمہیں   مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

....

تخت کے قابض وہی دیہیم ان کے ہاتھ میں   ملک ان کا، رزق کی تقسیم ان کے ہاتھ میں
صبر باقی ہے نہ ہم میں باہمی اعزاز ہے   سب کی ہے تذلیل اور تعظیم ان کے ہاتھ میں
مغربی رنگ وروش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب   قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں
سج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل   ہیں نہایت خوش نما دو جسم ان کے ہاتھ میں

....

خوشامد کرتے ہیں غیروں کی اور آپس میں لڑتے ہیں   یونہی بربادیاں آتی ہیں یوں ہی گھر بگڑتے ہیں

مذہب چھوڑو ملت چھوڑو صورت بدلو عمر گنواؤ ‏ صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ

....

ہو جنھیں مقدرتِ وضع و نفاذِ قانون ‏ بس انھیں کو صفِ اقوام میں نیشن سمجھو
آہ و فریاد سے قابو میں نہ آئے گا وہ یار ‏ طپشِ قلب کو بنگال ایجی ٹیشن سمجھو

....

لندن سے دہلی آئے ہیں دس یوم کے لیے ‏ یہ زحمتیں اٹھائیں فقط قوم کے لیے

....

آنر کے ساتھ نامِ گرامی بھی لکھ گیا ‏ لیکن ادھر سے خطِ غلامی بھی لکھ گیا

....

وقعت تمھاری شاہ کی منزل میں کچھ نہیں ‏ کاغذ پہ اعتراف مگر دل میں کچھ نہیں

....

لاٹھی بھلی ملی ہو اگر اس کی رگ سے رگ ‏ بیکار توپ جس کے ہوں پرزے الگ الگ

....

کلفت اسی کی مجھ کو ہے ہر آن ہر نفس ‏ لاکھوں کی سدِ راہ ہے دس بیس کی ہوس

....

یورپ کو پالیسی میں عجلت کی کیا ضرورت ‏ ہے ملتوی قیامت تقسیمِ ایشیا تک

گولیوں کے زور سے کرتے ہیں وہ دنیا کو ہضم
اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں

....

جو خردمند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات
خیر خواہی وہ نہیں جو کہ ہو ڈر سے پیدا

....

دستِ گلچیں بھر رہا ہے شاخِ گل پر بے دریغ
کون سنتا ہے چمن میں عندلیبِ زار کی

....

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

....

یہ طرز احسان کرنے کا تمھی کو زیب دیتا ہے
مرض میں مبتلا کر کے مریضوں کو دوا دینا

....

کرتے ہیں بتدریج وہ ظلموں میں اضافہ
قتل سے پہلے ہے کلورو فارم
مجھ پر اگر ان کا ہے کچھ احساں تو یہی ہے
شکر ہے ان کی مہربانی کا

....

عمر زنداں میں کٹی شوق رہائی رخصت
ہو گیا اُنس مرے پاؤں کو زنجیر کے ساتھ

....

مَس ہوائے باغ کا ہے اب پروں کو ناگوار
اتنا خوگر ہو گیا ہوں پنجۂ صیاد کا

....

اپنی نقاروں سے پنجہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

....

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے
رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی
کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی
نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی

....

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

....

پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے
شاہ اڈورڈ کی دہائی ہے